وَرَق وَرَق

ظ انصاری

پبلـــــــــــــــــشـــــــــــــــــرس
رائٹرس اکاڈیمی - ۵۹ محمد علی روڈ - بمبئی ۳

پہلی اشاعت ۱۱۰۰

کل صفحے ۲۰۰

سرورق اور ٹائپ۔ اعجاز پرنٹنگ پریس۔ بمبئی ۳
لیتھو۔ یونائیٹڈ فائن آرٹ پریس۔ مجگاؤں۔ بمبئی

اُن اَوراق کے نام

جو اس کتاب کی تنگ دامانی میں سمانے سے رہ گئے
ان میں کوئی ستر ورق تو ایسے تھے
جنہیں فخر تھا کہ انکے بغیر «ورق ورق» کی محفل بے جان رہیگی
اب وہ حسرت سے ایک دوسرے کا منہہ تک رہے ہیں
بے روزگار نوجوانوں کی طرح۔
اور پوچھتے ہیں ——— «ہمارا کیا قصور تھا؟»
میں جواب دیتا ہوں «معاشی بحران اور اشاعتی سنکٹ»
یہ کتاب چھٹنی کی زد میں آئے ہوئے انہی اوراق کے نام
معنون کرتا ہوں۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہ نیم باز کا

(غالب)

تین باب

پہلا ورق

قاعدے کے مطابق کتاب کا دیباچہ کسی ایسے آدمی کو لکھنا چاہئے تھا جسے میں یہ سمجھتا کہ وہ اپنے طور پر لکھے گا تو کتاب کی خوبیاں جتائے گا۔ اس کی کمزوریوں پر رنگین پردے ڈالے گا۔ اس کی باریکیوں کو (اگر ہوں تو) اجاگر کرے گا اور اپنی تحریر سے مجھے اور میری کتاب کو اہمیت بخشے گا۔ اس کے لئے میں نے ڈاکٹر ملک راج آنند، کرشن چندر، احتشام حسین راجندر سنگھ بیدی اور شیام لال کے نام سوچے تھے۔ ان میں تنہا شیام لال ایسے آدمی ہیں جو کئی زبانوں کے فن اور ادب پر گہری عالمانہ نظر رکھنے کے باوجود اردو پڑھنے والوں سے ناآشنا ہیں۔ وہ "ٹائمز آف انڈیا" میں لکھتے بھی ہیں تو فرضی ناموں سے چنانچہ میں نے انھی سے رجوع کیا۔ وہ تیار بھی ہو گئے تھے لیکن مجھے خیال گزرا کہ وہ بھی 'دل جوئی کرنے والا دیباچہ لکھیں گے۔ جانے دو۔

اس کتاب کا دیباچہ وہ لوگ خود لکھیں گے جو اسے اوسط درجے کی سوجھ بوجھ کے ساتھ پڑھیں گے۔ یہ کام اپنے دستور کے مطابق میں انھی لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔

ہاں چند سطریں، کسی انکساری یا لفاظی کے بغیر جان پہچان کے طور پر ضروری ہیں۔

"شانِ نزول ان اوراق کی یہ ہے کہ مجھے اپنی مختصر عمر کا کوئی حصہ یاد نہیں جب میں نے دیکھنے پڑھنے اور سننے کے ساتھ سوچا نہ ہو۔ جب لکھنا آگیا تو میں نے سوچی یا گزری ہوئی باتوں کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ آج کچھ لکھا، تھوڑے عرصے بعد اُسے اٹھا کر دیکھا تو وہ بہت ادنا درجے کی چیز معلوم ہوئی، اُسے پھاڑ پھینکا اور یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔

۱۹۴۶ء سے میں نے اوروں کی دیکھا دیکھی ایک اپنی ڈائری لکھنی شروع کر دی تھی۔ بعض باتیں اس میں سیاسی اور کبھی کبھی رازدارانہ ہوتی تھیں کانگریس اور مسلم لیگ کی عارضی حکومت (ہند) بن جانے کے بعد پولیس نے ہم لوگوں کی قیام گاہ پر چھاپا مارا اور نو (۹) گھنٹے تک ایک کونے کی تلاشی ہوتی رہی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ذاتی ڈائری پس کی گانٹھ بن سکتی ہے اس کا بھی قصہ پاک کر دو۔

پھر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ صرف انھیں سُنا کر جی نہیں بھرتا۔ دل چاہتا ہے محفوظ کر لو، ان میں سے بعض میں نے ۱۹۴۸ء میں لکھ کر "مشاہدے" کے عنوان سے چھپوا دیئں۔ وہ پسند کی گئیں، ہمت بڑھی۔ کوئی ۲۲-۲۳ مشاہدے لکھے جس میں کچھ تو اپنی ذات سے خطاب ہوتا تھا، کچھ اپنے پڑھنے والوں سے یہ سلسلہ مقبول ہوتا گیا۔

شاہد ہفتہ وار بند ہوا تو مشاہدے بھی گئے۔ پھر میں نے سوچا اب کی بار ڈائری لکھی جائے مگر اس میں صرف ایسی باتیں ہوں کہ دوست یا دشمن کسی کی پکڑ میں نہ آئیں۔ ۱۹۵۸ء میں اس ڈائری کے بھی کوئی تین۔ سوا تین سو ورق ہو گئے۔ بعض ان میں ایسے ورق بھی تھے جو میرے سوا دوسروں کی دل چسپی کا سبب بن سکتے تھے۔ چناں چہ ان کا میں نے انتخاب کیا پھر بھی ڈیڑھ سو کے قریب رہ گئے۔ ڈیڑھ سال میں وہ اور بڑھ گئے۔ ان میں سے اکثر ورق ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ جس دن جیسا موڈ طاری ہوا اور موضوع نے جدھر آسانی سے موڑ لیا بس ویسا ہی کوئی نثر پارہ لکھا گیا۔ انھیں چھانا تو معلوم ہوا کہ کسی کا انداز نظمِ آزاد کا سا ہے۔ کسی کا صوفیانہ، کسی کا انداز خطیبانہ ہے، کسی کا صحافیانہ اور کسی کا فلسفیانہ (حالانکہ فلسفے سے میں بڑی حد تک ناآشنا ہوں) ان میں سے کس کو چنیں کس کو چھوڑ دیں۔ دشواری ہوئی تو انتخاب کے وقت میں نے تین زبردستی کے خانے بنا لیے جیسے کابک میں بنائے جاتے ہیں۔ اور کبوتروں کو ان خانوں میں تقسیم کرتے وقت صرف اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے لڑیں نہیں۔ میں نے بھی اس تقسیم اور انتخاب میں صرف اتنا ہی خیال رکھا ہے۔ اور ان رنگارنگ تحریروں کو تین خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ پھر بھی دیکھتا ہوں کہ انتخاب کیے ہوئے کئی درجن نثر پارے یہاں شامل ہونے سے رہ گئے۔

اب اگر یہ کتاب مقبول ہوئی تو انھیں اگلے اڈیشن میں دیکھیں گے۔

شانِ نزول کے علاوہ دوسری بات،

کیا میں نے ان کے لکھنے میں کسی خاص مصنف کی تقلید کی ہے؟ یا محض اچھوتے پن کی خاطر لکھ گیا ہوں؟ بعض لوگ ممکن ہے اس میں خلیل جبران کو تلاش کرنے کی کوشش کریں، بعض کو نیٹشے کی تصنیف "بقول زردشت" کا خیال گزرے گا۔ بعض ٹیگور کا اثر پائیں گے۔ بعض فلک پیما کے مضامین جوشؔ کے نثر پارے یا وہ جو دس بارہ برس پہلے اردو میں انشائے لطیف چل نکلی تھی، اس کا کھوج لگائیں گے لیکن وہ سب غلطی کریں گے۔ جبرانؔ اور ٹیگورؔ دونوں صوفی ہیں۔ ایک مسیحی دوسرا ویدانتی۔ فلک پیما کے یہاں تفریحی عنصر زیادہ ہے اور جوشؔ کے یہاں نثر کی شاعری۔ رہی "انشائے لطیف" سو اس میں فضول کی لفظ پیمائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کسی کا اثر شعوری طور سے میری تحریر پر کہیں نہیں ہے اور نہ ہونا ممکن ہے۔

البتہ کچھ لوگ اور ہوئے ہیں جنھوں نے ڈائری لکھی۔ آپ بیتی لکھی یا سفر نامے لکھے، یا دداشتیں لکھیں اس انداز میں کہ وہ پڑھنے والوں کے لئے بھی مفید ہو سکیں۔ پیپس کی ڈائری جنھوں نے دیکھی ہے وہی کچھ اس کی لذت سمجھ سکتے ہیں۔ گورکی نے جو آپ بیتی لکھی اس کا ترقی پسند ادب میں ایک بلند مقام ہے ادھر سامرسٹ ماآم نے "مصنف کی نوٹ بک" کے نام سے اپنی یاد داشتیں محفوظ کیں۔ بعض سفر ناموں میں بھی ایسے ٹکڑے ملتے ہیں۔ شیخ سعدیؔ کی گلستان

میں بھی آپ بیتی، یادداشت اور سفرنامے کی ملی جلی کیفیت اکثر جگہ ملتی ہے
تقلید بری بات نہیں اگر سلیقے سے کی جائے۔ مجھے تقلید کرنی ہوتی تو ان میں سے
گورکی اور سعدی کی تقلید ضرور کرتا لیکن واقعہ یہ بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے ان
مصنفوں کے مطالعے کی وجہ سے کچھ نقوش ایسے رہ گئے ہوں جنھوں نے
"ورق ورق" کے کسی حصہ کو اپنے طرز پر ڈھال لیا ہو، لیکن یہ بھی نادانستہ ہوا
ہوگا۔ اور اس لئے کہ مجھے اس قسم کے کسبِ نور سے کوئی ضد نہیں ہے۔

ان تمام ناموں میں صرف سامرسٹ ماآم کا نام ایسا ہے کہ اگر مجھے بتایا
جائے کہ فلاں نثرپارے کا فلاں جملہ یا ترکیب ماآم سے ملتا جلتا ہے تو میں اسے
اپنے یہاں سے خارج کرنا پسند کروں گا۔ البتہ ایک بات ہے۔ اگر ان کی
"نوٹ بک" شائع نہ ہو چکی ہوتی تو مجھے یہ ورق کتابی شکل میں چھپوانے کا خیال نہ آتا۔
میں نے صرف اچھوتے پن کی خاطر بھی ایسا نہیں کیا ہے کیوں کہ اسی کتاب میں
آدھے سے زیادہ نثرپارے ایسے ملیں گے جنھیں نثر کی مقررہ اور عام اصناف
میں آسانی سے جگہ دی جا سکتی ہے۔ مثلاً "سمجھوتہ" یا "ظہور سیٹھ" افسانے میں
جگہ پا سکتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ مختصر
افسانوں کی شکل میں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً "ایک پہیلی"۔ "تلاش"
"انتقام" یا "شکست کی آواز"۔ کچھ ایسے ہیں کہ انھیں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین
بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے "روزگار"۔ "برقعہ" یا "میں بھی حاضر تھا وہاں"
کچھ کو مقالے کی صورت دی جا سکتی تھی۔ جیسے "مطالعہ"۔ "علم اور شعر"۔

"سکوں کا مقابلہ" یا "ادب کی تخلیق" وغیرہ۔ کچھ ایسے تھے کہ میں خود انھیں آسانی کے ساتھ پابند نظم یا آزاد نظم کے روپ میں پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً "بچے" کی آنکھیں"۔ "استقبال"۔ "ماں کا دل"۔ "۱۶ اگست"۔ "بھرپور چاندنی" "اندیشہ ہائے دور و دراز"۔ "عشق ومنو" وغیرہ۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو "ورق ورق" کے اکثر حصوں میں کوئی خاص اچھوتا پن نہیں ہے اور اس کے زیادہ تر نثر پاروں کا موضوع اور بیان وہی ہے جو لکھنے والوں کے زیر مشق رہتا ہے۔

مگر اس کے باوجود "ورق ورق" میں ایک اچھوتا پن ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک یہ کہ اس کے لکھنے کا بنیادی نظریہ وہ ہے جو باآواز بلند سوچنے والے کا ہوتا ہے۔ خیال کے فانوس پر صبح سے شام تک کے مختلف حالات، مختلف ماحول، مختلف واقعات کی تصویریں دوڑتی ہیں۔ ان میں کوئی مخصوص ترتیب نہیں ہوتی مگر اس رنگا رنگی کے باوجود (آدمی کا شعور اگر ایک ڈگر بنا چکا ہو تو) وہ اپنے طور پر ان کا ایک سلسلہ قائم کر لیتا ہے۔ بات سے بات نکالتا ہے اور جزئیات سے نتیجے اور ایک نتیجے سے دوسرے نتیجے۔

کسی کتاب کے ورق کو پڑھ کر یا سڑک کے حادثے کو دیکھ کر ـــــ اگر ان دونوں کا موضوع ایک نہیں ہے تو انسان کے دماغ پر دو الگ الگ رد عمل ہوں گے اور ان دونوں کے ردِ عمل سے اس کا موڈ بھی مختلف ہوگا۔ سوچ کا

انداز بھی دوسرا ہوگا اور اسے بیان کرنے یا نقل کرنے کا انداز بھی۔ کبھی اس کا بیان صرف ایک جملے میں کافی ہوگا، کبھی ۱۰۱ جملوں میں۔ کبھی سادگی کے ساتھ کبھی آرائش کے ساتھ۔ میں نے اِن "اوراق" میں اصلیت کو بالکل اسی سبب سے اور اسی طرح سے باقی رکھا ہے۔

دوسرے یہ کہ میرے لکھنے کا ایک طرز ہے جو بہت سی طرزوں کے گھُل مِل جانے سے اور نئے رنگوں کی آمیزش کرنے سے بنا ہے۔ میں نے زبان کے بھی کچھ تجربے کرنے چاہے ہیں جن میں عام ہندی اور انگریزی الفاظ و تراکیب کے ساتھ عام بولیوں کو اور عام لوگوں کے لب و لہجہ کو بڑا دخل ہے۔ یہ تجربہ میرے لئے ابھی پہلی دوسری منزل میں ہے۔ کتابوں کا ترجمہ یا تالیف کرتے وقت بھی میں نے اس کا پورا خیال رکھا اور یہاں بھی۔

"ورق ورق" میں میری یہ جرأت اور بڑھی ہے۔ اور پڑھنے والے جب ان ورقوں کو غور سے دیکھیں گے تو انھیں محسوس ہوگا کہ وہ کسی تجربہ گاہ میں کھڑے ہیں، جہاں چھوٹی بڑی بوتلیں، بڑا سا قرع انبیق، کچھ اسینس، کچھ عرق اور کچھ ورق بے ترتیب سے پڑے ہوئے ہیں، مگر بے مقصد نہیں پھر مقصد کیا ہے؟ یہ میں ابھی سے بتا دوں تو مزہ جاتا رہے گا۔ آخری ورق پڑھ جانے کے بعد جب آپ کتاب بند کریں گے تو وہ مقصد خود ہی آپ سے سوال جواب کرے گا۔ مجھے یقین ہے۔

انفرادیت کا احساس ہونے ہوئے بھی میں اسے کبھی گوارا نہ کرتا کہ کسی سماجی خدمت کا مقصد سامنے رکھے بغیر میں سماج کے ان پچاسوں آدمیوں کی محنت اپنی اس کتاب پر صرف کرادوں جس کی محتشم کاشانی نے کتابت کی۔ ظفر آرٹسٹ نے سرورق بنایا، گنپت نے چھاپا۔ صادق نے جلد بندی کی۔ بیسیوں دوکاندار اسے اپنے یہاں رکھیں گے۔ سیکڑوں آدمی اپنی گاڑھی محنت کی کمائی سے پیسے بچاکر خریدیں گے اور اپنے قیمتی وقت کا ایک حصہ نکال کر پڑھیں گے۔ سماج کے اتنے بہت آدمیوں کی مقدس محنت اور فن اور ذوق کو صرف اپنا اچھوتا پن اور بیان کی مشاقی یا انفرادی مذاق کے جتانے پر غارت کر دینا میں سمجھتا ہوں پرلے درجے کی غداری ہے اور بے ایمانی بھی۔

مجھے امید ہے کہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والے چاہے کچھ بھی کہیں لیکن مجھے بے ایمانی کا ملزم قرار نہیں دیں گے۔ اور میرے لئے یہی بہت ہے۔

ظ انصاری

۱۷۰- ای - کیڈل روڈ

بمبئی ۱۶

بچّے کی آنکھیں

بچّے کی آنکھیں مستقبل کا نور ہیں
اس نور کو اپنی آنکھوں میں بسا لو
اسے چوم لو
اسے سینے سے لگا لو
وہ ہر ایک نور سے زیادہ نورانی ہے
بچّے کی آنکھوں سے ہوشیار رہو
وہ بوڑھی آنکھوں سے بھی زیادہ تولنا جانتی ہیں۔
بچّے کی آنکھیں
جھیل کے شفّاف پانی سے زیادہ پاکیزہ ہوتی ہیں
کہیں کوئی کنکری نہ پھینک دینا
بچّے کی آنکھیں
بلّور سے زیادہ شفاف ہوتی ہیں
لوحِ محفوظ سے بڑھ کر ہر ایک نقش محفوظ رکھتی ہیں

تمھاری نیتّوں کا غبار اور سانسوں کی کدورت بھی اُن پر نقش
ہو جاتی ہے۔
دیکھو، بھائیو!
بچّے کی آنکھیں
تمھاری نیتّوں کا حال تمھاری آنکھوں میں پڑھ لیتی ہیں

ضمیر پر زبان کا خول چڑھانے والو!
اے ریاکاری کے بندو!
تم دولت مندوں کو خوشامدیں کر کے دھوکا دے سکتے ہو
وہ تمھاری خوشامد پڑھتے ہیں۔ آنکھیں نہیں پڑھتے۔
تم اپنے چالاک دشمنوں پر
لفظوں کے طومار کا جال بُن سکتے ہو
وہ لفظوں کی میٹھی مار کھا جاتے ہیں
اور جال پر اُن کی نظر نہیں جاتی
ان کی نظر خود اپنے بُنے ہوئے جالوں میں اُلجھی رہتی ہے۔
ان کی نظر پہلے سے کثیف ہوتی ہے
لیکن معصوم بچے کی معصوم آنکھیں
نہ انھوں نے جال بُنے ہیں

اور نہ جال ان کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں

۲۰ر نومبر ۱۹۵۱ء

ذہانت اور اس کی دھار

آج ایک بلیڈ میرے ہاتھ سے پتھر کے فرش پر گر گیا
اور گرتے ہی اُس کی دھار جاتی رہی
میں نے سوچا کہ یہ وہی پتھر ہیں جنھیں بسولوں نے تراشا ہے
اور بسولوں کی دھار نہیں بگڑی
اس پر میں نے لکھا

اے ذہین لوگو!
تمھارے چہروں پر میں ملال کے آثار دیکھتا ہوں
تو خود ملول ہو جاتا ہوں

تم نے تیشہ زن کے ہاتھ میں تیشہ دیکھا؟
وہ دن بھر ڈامر کی سڑک پر
اور لکڑی کے لٹھوں پر

اپنی کدال اور کلھاڑے چلاتا ہے
اور پھر بھی اُن کی دھار نہیں جاتی
یہ دھار نازک نہیں ہوتی

تم نے فرہاد کا قصہ سنا ؟
اُس کا تیشہ
پہاڑ کی چٹانوں پر سر پٹکتا رہا
شیریں کے لئے بھی اور شیریں کے بغیر بھی
لیکن فرہاد ؟
ایک ناکامی اور ایک صدمے کی چٹان پر اُس نے سر پٹکا
اور ہلاک ہو گیا
دھار بہت نازک اور حس بہت شدید تھی

اے ذہین لوگو !
ذہانت اور احساس کی شدّت
ازل سے ایک ساتھ چلے آتے ہیں
ان کی دھار جتنی تیز ہو گی، اتنی ہی نازک ہو گی
اسے ملال اور صدمے کی چٹانوں سے بچا بچا کر رکھو

کدالوں اور کلھاڑیوں کی طرح نہ چھوڑو

۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء

استقبال

فتح کا نشان اُٹھائے ہوئے
وہ دیکھو! جلوس آ رہا ہے
اُٹھو، بھائیو! استقبال کے لئے اُٹھ کھڑے ہو

کراہتے ہوئے زخمیوں کو سہارا دے کر اُٹھاؤ
انھیں خوش خبری دو
وہ انھی لمحوں کے لئے بیتاب تھے
اس جواں مرگ کی لاش کو اپنی کمر پر اُٹھالو بازوؤں کی طاقت سے
یہ لاش نہیں، ایک گلدستہ ہے خونیں کفن
سلیقے سے اُٹھاؤ
ہاں ایسے۔
اِستقبال کے لئے تیار ہو جاؤ
مجاہدوں کا جلوس آ رہا ہے

پھر پھول نہیں ملے ؟
کس نے کہا ؟
وہ پھول جو بازار میں بکنے آئے تھے
سکوں سے خریدنے والے لے گئے
لیکن یہ پھول ـــــ
یہ گرم اور تازہ دہکتے ہوئے لہو کے پھول
ہم ان کے خریدار تھے
ہم انھیں سمیٹ لائے ہیں
رسمیں بدل گئی ہیں
مجاہدوں کے استقبال کے لئے انھی پھولوں کی ضرورت تھی
وہ دیکھو جلوس آ رہا ہے

ماں، تمھارا بچہ کہاں ہے ؟
اسے بلاؤ ۔ اسے آج کے دن کی بڑی تمنا تھی
بڑی بی ، تمھارا جگر بند کہاں گیا ؟
جاؤ اسے خبر کر دو کہ جلوس آ رہا ہے ۔
دوڑو بیٹا ،
وہ دیکھو ، فتح کے نشان قریب آ گئے ہیں ۔

مگر تم دوڑ نہیں سکتے
تمھارے پیر خونخواروں کی گولی کا نشانہ بن چکے ہیں
اچھا، تو انھیں گود میں اٹھالو
ان کے ناز اٹھانے کا وقت آگیا ہے
کیوں، تم چپ کیوں ہو؟
کیا تمھارا بچّہ نیند میں ہے؟
جاؤ اُسے جگا دو!
" بھائی، فتح کے جلوس کا انتظار کرتے کرتے
میرا لال راہ تک تک کر سو گیا
آخری نیند"
اچھا تو اُسے گود میں اُٹھالو
تیار ہو جاؤ
ہمارے پاس نکھرے ہوئے پھول ہیں اور ناشگفتہ کلیاں بھی
ہم یہ ہار لئے کھڑے ہیں۔
لو۔ آج ہم اِن سے استقبال کریں گے
مُندی ہوئی آنکھیں کھل جائیں گی۔
فتح کے تمنائی فتح مندوں کو بڑھ کر سینہ سے لگائیں گے
فتح کے نشان اٹھائے ہوئے

مجاہدوں کا جلوس آپہونچا ہے
"افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو"

۸ ستمبر سنہ ۳۹ء

عشق

عشق کرو میرے بھائیو!
گوشت اور پوست کا عشق
وصل اور ہجر کا عشق
جی کھول کر تڑپنے اور مسکرانے کا عشق

جُلاب سے معدے کی طہارت ہوتی ہے
انقلاب سے سماج کی طہارت ہوتی ہے
لگن سے فلسفے کی طہارت ہوتی ہے
اور عشق سے ہوس کی طہارت ہوتی ہے

عشق ایک ہتھیار ہے حوصلوں کے ہاتھ میں
ایک پکار ہے، ولولوں کے سامنے

ایک شکست ہے بزدلوں کے لئے
اور ایک قوت ہے جواں مردوں کے لئے

جیتے جی کم از کم ایک بار
عشق ضرور کر لینا
سینے سے لگائے رکھنے کے لئے کچھ یادیں
پختہ کار ہونے کے لئے کچھ نارسائیاں
عشق عطا کرتا ہے

عشق ایک تیزابی مادّہ ہے
جس کی بدولت
آدم خاکی کی کم ظرفی کچھ دُھل جاتی ہے

۴ر ستمبر سنہ ۵۰ء

زندگی

"جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی"
یہ ایک مصرعہ خود زندگی کی طرح لازوال اور ابدی سچّائی ہے

انجانی راہ، انجان راہی

یہ ایک انجانی راہ ہے

وہ جو ہوس کی پیاس بجھانے کے لئے،
جھونپڑے اور کوٹھے اور محل پھلانگتا چلا جا رہا ہے
اُسے کیا خبر کہ راہ میں عشق کہاں اس کا دامن تھام لے گا
دامن جو تار تار ہو کر بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا

اور یہ افلاطون کا نادیدہ پرستار
جو چاند کو تکا کرتا ہے
اور کوہِ قاف کی پریوں کی ہم آغوشی کے تصور سے لجاتا ہے
اُسے کیا معلوم
ہوس کہاں گھات لگائے بیٹھی ہے
اور کب اُسے اسیر کر کے کوہِ قاف سے نیچے پھینک دے گی
نیچے، بے ہنگم غاروں میں۔

جہاں عشرت تو ہے، پائدار تسکین اور راحت نہیں ہے

پینے والے لبوں اور لبِ پیالہ کے درمیان حوادث ہیں مگر کم
قطرے سے گُہر تک کا فاصلہ طے کرنے میں خطرناک حلق ہیں مگر کم

لیکن ہوس سے عشق تک
اور عشق سے ہوس تک
اَن جانے راہی کو جو اَن جانی راہ طے کرنی ہے
اس پر بڑے حوادث ہیں اور بے شمار گھاتیں
بے نام، بے مقام اور بہ ظاہر بے تاویل

۴ر نومبر ۱۹۴۳ء

طنز

مہادیو کی طرح
زندگی کے سمندر کا متھا ہوا زہر خود پینا
اور آبِ حیات دوسروں کے لئے چھوڑنا
طنز، لکھنے کی پہلی شرط ہے میرے عزیز۔

بھرپور چاندنی

کل رات ہولی جلا دی گئی
آج بھرپور چاندنی رات ہے

غالب بیچارے خشکی کے جانور تھے
سمندر کی قربت انھیں نصیب نہ ہوئی
ورنہ وہ اسی خیال کو کسی اور طرح کہتے
"تھیں بناتُ النّعشِ گردوں شب کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں"

ارے دیکھو!
دن بھر تو سمندر کا پانی میلوں تک اُترا ہوا تھا
اور اب جو چاندنی رات جوبن پر ہے
تو سمندر کی جوانی بھی جوش مارنے لگی
بھرپور چاندنی میں

کس بلا کی لطافت ہے ، خُنکی ہے ، سہانا پن ہے ، مہک ہے
جیسے موتیا کے پھولوں کو گوندھ کر ایک چادر بُن لی
اور ساری کائنات کو اوڑھا دی ، قدرت کے حنائی ہاتھوں نے

دیوانگی تو بڑی پُر شور ہوتی ہے
مگر یہ بھرپور چاندنی
نور کے کُہرے کی طرح
ایک ایسی دیوانگی برسا رہی ہے جو خواب آلود ہے
ایک ایسا خواب جس میں ذہن و تفکّر کی ساری تکان اُتر جاتی ہے

فکر کا جمال بے حجاب ہے
اور اتھاہ لذّت میں ڈوب چکا ہے
جیسے کوئی نورَس کلی پھولوں کی سیج پر
شبنم کے قطرے جذب کرتے وقت
آنکھیں بند کر لیتی ہے اور لب کھول دیتی ہے
اور اتھاہ لذّت میں ڈوب جاتی ہے ۔

پاگل

سڑک سو رہی ہے
اپنے تھکے ہارے بے سروسامان بچوں کو دونوں پہلوؤں پر لیٹے ہوئے
جن بے قراروں کو کسی پہلو نیند نہیں آئی، وہ کروٹیں بدل رہے ہیں
ان میں سے کوئی بے چین ہو کر اٹھتا ہے تو سڑک کی بھی نیند ٹوٹ جاتی ہے
میں بے سبب اس عالم میں گھوم رہا ہوں
کچھ نہیں کھلتا کہ رات کا یہ سناٹا مجھے کہاں لے جا رہا ہے

تھوڑے فاصلے پہ گلی سے ایک پاگل آدمی نکلا
بڑبڑاتا، خود سے باتیں کرتا، اور شور مچاتا
ہم دونوں آدمی گلی اور سڑک کے سنگم پر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے
اور پھر ایک دوسرے کا راستہ کاٹتے ہوئے نکل گئے
اس کے بڑبڑانے میں بھی ایک تسلسل تھا اور ایک ہم آہنگی
میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی
اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا
وہ مجھ سے پوچھ سکتا تھا۔

بتاؤ دوست !

یہ تمھاری دانائی کا جنون اچھّا ہے ؟

جس کی نہ کوئی منزل ہے نہ نشانِ منزل

یا میرے جنون کی دانائی،

جو سوئی ہوئی سڑک کو جگا کر تسکین حاصل کر رہی ہے ؟

اور مَیں خاموش ہونے سے پہلے صرف اتنا کہتا،

میرے عزیز !

ہمارے تمھارے راستوں کا بہر حال ایک سنگم ضرور آتا ہے

میں سوچتا ہوں کہ دیکھو

دانائی کے جنون اور جنون کی دانائی میں بھی ایک قربت ہوتی ہے

میں سوچتا ہوں کہ یہ بات شاید کسی نے کہی ہو گی کہ

پیغمبر اور پاگل میں صرف کامیابی اور ناکامی کا پردہ حائل ہے

مگر یہ بات پیغمبر نے نہیں، کسی پاگل نے کہی ہو گی

ایک آدمی پاگل کو زور سے گالی دیتا ہے

ارے کمبخت ! چُپ نہیں رہا جاتا تجھ سے

میں سوچتا ہوں کہ کون جانے

"یہ کمبخت"
کس راز کو خاموش رکھنے کی سزا بھگت رہا ہے
اور کس بات کی پردہ داری نے اسے آج یوں چھینے پر مجبور کر دیا ہے

نَو دَو لیتیے

(انگریزی میں "اَپ اسٹارٹس" کے لفظ سے یہ مفہوم ادا ہوتا ہے)

فلم والوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کی صنعت میں کرائسس بہت سخت ہے، روپیہ لگانے والے روپیہ کم لگا رہے ہیں نام ور آرٹسٹ روپیہ اپنی طرف بہت گھسیٹ لیتے ہیں۔ پبلک کا مذاق بگڑا ہوا ہے۔ وہ ستھری اور اعلا فلموں پر دھیان کم دیتی ہے۔ پبلک کے پاس پیسہ کم ہے۔ وہ کم فلمیں دیکھتی ہے۔

لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ ان کی ذہانت کا استعمال نہیں ہونے پاتا۔ ادیبوں کو ادبی جوہر دکھانے کی سہولت نہیں ملتی گدھوں کی گردن میں سنہرے ہار پڑے ہیں اور اصیل گھوڑوں پر گدھوں کی جھول کسی جاتی ہے۔ گروپ بندی نے آگے

بڑھنے کی راہیں روک رکھی ہیں

مجھے شکایت ہے کہ فلم انڈسٹری ننگوں کا حمام اور نودولتیوں کا میلہ ہے۔ ادیب وہاں ادبی لبادہ اتار کر گھستے ہیں۔ بڑے بڑے ویسر وہاں بیوی کا زیور بیچ کر آتے ہیں۔ "یہ آرٹ کی پیداوار" فرمانے والے اکثر لوگ صرف ایک کام کے لئے موزوں ہیں۔ وہ کام ہے جعلی سکے تیّار کرنا۔ سو واقعی سکّے وہ اچھے خاصے ڈھال لیتے ہیں۔

نودولتیوں کے اس میلے میں جاکر دیکھیے
یہ اونچی اونچی کریپ سول کی ایڑیوں کے جوتے
یہ گُچھے دار بڑھی ہوئی زلفیں
یہ موٹے موٹے فریموں کے سیاہ چشمے
یہ پلے ہوئے جسموں پر موٹے بٹن اور شانوں پر اُبھرے ہوئے کوٹ۔
یہ کریم اور پاؤڈر کی تہیں
انھیں اپنی پستی کا کتنا سنگین احساس ہے
کہ اپنے حُلیے پر بھی بلندیاں طاری کئے رہتے ہیں۔

۴ر اکتوبر ۱۹۵۱ء

سطح اور تہ

سیپیاں اپنے بطن میں قطرے لے کر
سمندر کی تہ میں چلی جاتی ہیں اور موتی اُگلنے میں لگی رہتی ہیں
شیر اپنی خوراک کا حصہ دبوچ کر
گھنے کچھار میں چلے جاتے ہیں اور اسے ہضم کر لینے تک نہیں نکلتے
مردانِ خرد مند اپنا اپنا مشن لے کر
عمل گاہوں میں، کتب خانوں میں، ٹریڈ یونینوں میں
اور انجانے مقامات میں کھو جاتے ہیں اور کسی کو خبر نہیں ہوتی
کہ عملِ پیہم اور یقین محکم کے متوالے، انسانیت کو ایک منزل
آگے تک لے جانے کے لئے کتنی راتوں کو صبح کر چکے ہیں۔
کتنی چلچلاتی دوپہروں کو سردی کے کہرے میں بدل چکے ہیں
کتنے مصائب خود ان کے سر سے گزر گئے اور انھیں خبر نہ ہوئی

لیکن میرے بھائی! ذرا ان تنکوں کی دیدہ دلیری تو دیکھو
کہ سمندر کی موجوں کی سطح پر بہے چلے جاتے ہیں
ذرا اس بے مایہ جھاڑ جھنکاڑ کی تشہیر پسندی تو دیکھو

جو آندھی کے جھونکوں کے آگے اُڑا پھرتا ہے
اور ان خوشنما چھلکوں کو دیکھو ——
جو خود تو مغز سے بے بہرہ ہیں مگر مغز پر چھائے رہتے ہیں

ہائے —— ، یہ صرف اسٹیج پر گرجنے والے!

۶ر دسمبر ۱۹۵۱ء

ماں کا دِل

دل اور عقل میں فرق کرنا
ابنِ آدم نے پہلی بار ماں کے دل سے سیکھا ہوگا
ماں کا دل محض دھڑکنے والا دل ہے

کوئی دِل عقل کے اثر سے آزاد نہیں
عاشقِ جاں باز کا دِل بھی
ایک بار سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے،
اگرچہ اس سے انکار بھی ضرور کرتا ہے
لیکن ماں کا دل

صرف ایک سادہ اور سچّا دل ہے
جو محبت کے سب سے پہلے خمیر سے تیار ہوا ہے

ماں کا دِل اتھاہ سمندر ہے
سمندر کے بھی کنارے ہوتے ہیں
مگر ممتا کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں

ماں کا دل محبت کا خزینہ ہے
جہاں تمام محبتوں کی حدیں ختم ہوتی ہیں
وہاں سے ممتا کی سرحد شروع ہوتی ہے
بلکہ سچ پوچھو تو
وہ نہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے

سورج کی طرح
ماں کا دل ہی اس نور کا سرچشمہ ہے
ماں کا دل ہی اس کی آخری بلندی ہے
اور ماں کا دل ہی اس کا آخری نشیب بھی ہے

۹ ۸ر جولائی ۱۹۴۸ء

ماں کا دِل[2]

آج مجھے بے اختیار اپنی ماں کی یاد آئی
وہ ماں، جس کی قربت مجھے ناگوار گزری
وہ ماں جس کی محبّت میری "خطر پسند" طبیعت کو راس نہ آئی
وہ ماں، جس کی ناوان محبّت مجھے ہمیشہ مشتعل کرتی رہی

آج مجھے بے اختیار اسی ماں کی یاد آئی
اس لئے نہیں کہ ماں کا وجود مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے
اس لئے کہ ماں کا دِل مجھے بہت قریب محسوس ہو رہا ہے

ایک ماں دو بچّوں کو گود میں لئے بیٹھی ہے
ننھا بچّہ ماں کے سینے سے زندگی چوس رہا ہے
اس کی بڑی بہن
پھولوں کی فراک میں گلدستہ بنی ہوئی
ماں کے گلے میں باہیں ڈالے جھول رہی ہے

ماں کا دل اِن دونوں ستونوں کے درمیان رقص کر رہا ہے

ماں کے چہرے پر چاندنی کھلی ہوئی ہے

ایسی خُنک، ایسی شفّاف چاندنی،

جس میں مجھے فرشتوں کے دامن لہراتے دکھائی دے رہے ہیں۔

نورِ اَزل مُسکرا رہا ہے

نورِ اَبد مُسکرا رہا ہے

فرشتے سجدہ کرتے جاتے ہیں اور گزرتے جاتے ہیں

ماں اپنے دونوں بچوں کو ایک ساتھ چوم لیتی ہے

۲۸ر جنوری سنہ ۵ء

اَدَبْ کی تخلیق

ادب کی تخلیق ان الفاظ کا نام نہیں ہے جو لکھے جاتے ہیں

ادب کی تخلیق، عمل کا ایک سوچا سمجھا سلسلہ ہے

اَدَب کی تخلیق میں بھی تخلیق کے سارے مرحلے آتے ہیں

اور ان میں ایک ترتیب بھی ہوتی ہے

جذب اور لذت۔ بوجھ اور بے چینی۔ پرہیز اور نشو و نما۔

صورت گری اور صحّت۔ پھر درد، ادائیگی، بالآخر تسکین۔

جنم دینے والے کی تسکین،
آغوش میں لینے والوں کی تسکین

زمین،
(وہ چاہے ماں کا بطن ہو پاکستان کا کھیت یا ادیب کا دماغ)
ایک نونہال کو تخلیق کرنے تک ان سارے مرحلوں سے گذرتی ہے
اگر ایک مرحلے میں بھی کچّا پن رہ گیا
تو وہ آخری تسکین میں حائل ہوگا
اور حائل ہوتا رہے گا۔

کل میں ایک دوست کے گھر گیا
جن کے ہاں نیا وجود ابھی صورت گری کی منزل میں ہے
میں نے دُلھن کی خواب گاہ کو سجا ہوا دیکھا
یونانی تندرستی کے مجسّمے،
تخلیقی حُسن کے نمونے،
در و دیوار کی زینت بنے ہوئے تھے۔
اور ایک شیر کا جوڑا، ہیبت ناک دہانہ
دُلھن کے سرہانے میز پر رکھا تھا۔

میں نے پوچھا
تو وہ کہنے لگے
"تخلیق کے زمانے میں ماں کے خیالات، ماں کا رجحان، ماں کا ماحول اور ماں کے تاثرات، بچے کے ذہن و جسم کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا ٹھیک کہتے ہو۔
فریدوں کی ماں کو
مظلوم ایرانیوں کا رہنما تخلیق کرنے کے زمانے میں
قاتل ضحاک کی غارت گری سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑیوں میں پناہ لینی پڑی تھی۔
تم ٹھیک کہتے ہو
کارل مارکس کو
دنیا کی ایک عظیم کتاب تخلیق کرنے کے زمانے میں
لندن کی میوزیم لائبریری میں جلاوطنی کے کئی سال بسر کرنے پڑے تھے
اور جولس فیوچاک کو
موت شکن تاثرات تخلیق کرنے کے زمانے میں
ہٹلر کی خوفناک پھانسیوں کے سایے میں شہید و کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔

۲ر فروری ۱۹۵۲ء

روزگار

سیّد انشا نے اب سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کہا تھا ؎

سخنیوں کا عجب کچھ حال ہے اس عہد میں یارو
جہاں پوچھو، یہی کہتے ہیں، ہم بیکار بیٹھے ہیں

سنہ ۴۷ء کے بعد سے یہی حال ہمارے یہاں کا ہے
بے روزگاری کا ایک دور سنہ ۲۹ء سے سنہ ۳۲ء کے سنکٹ میں بھی آیا تھا، مگر اب کی بار حالت اور بھی دگرگوں ہے۔

جب لوگ کہتے ہیں کہ بے روزگاری عام ہو رہی ہے، تو میں سوچتا ہوں کہ یہ بات بلا شرط نہ کہنی چاہیئے
بے روزگاری صرف ان لوگوں میں عام ہو رہی ہے جو ایمان داری سے کچھ روزگار کرنا چاہتے ہیں۔ جو محنت سے روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ وہ جو سمجھتے ہیں کہ روزگار کے معنی ہیں کام اور اس کے دام۔

ورنہ ویسے دیکھو تو روزگار کی کیا کمی ہے، احسان ہے اُس مالک کا۔

جب کوئی مرنے لگتا ہے تو آس پاس کے لوگوں کے لئے مفت کا ایک کام نکل آتا ہے۔ ایک آدمی مرنے والے کے سرہانے سورہ یٰسین پڑھے گا (جن کے ہاں یٰسین نہیں ہے ان کے ہاں دوسری یاسینیں ہیں) پھر کچھ لوگ رونے کے لئے بیٹھیں گے۔ کچھ اپنے اوپر رونے کا موڈ طاری کریں گے، کچھ بازار کو دوڑیں گے کہ آخری رسموں کے ادا کرنے کا سامان لائیں۔ کچھ دوڑیں گے کہ اس چل چلاؤ کے آخری لمحے میں اپنے مستقبل کا سامان کرلیں۔ کچھ ان دوڑنے والوں کا ہاتھ بٹانے کے لئے دوڑیں گے کہ یہ:۔

رسم دنیا بھی ہے، موقعہ بھی ہے، دستور بھی ہے

کچھ لوگ پچھلا حساب جوڑیں گے۔ کچھ لوگ آگے کا حساب لگائیں گے۔ کچھ لوگ قبر کھودیں گے، کچھ قبر کھودنے والے کو بلانے جائیں گے، کچھ لوگ جنازے کا بوجھ اٹھائیں گے۔ کچھ ایسے ہوں گے جو جنازے کا ساتھ دینے کے لئے اپنے وجود کا بوجھ دوسروں سے اٹھوائیں گے کچھ ہوں گے کہ مرحوم یا مرحومہ کی فاتحہ ہونے اور پلاؤ بٹنے کا انتظام کریں گے، اور کچھ لوگ اس دن کا انتظار۔

ایک آدمی کے مرنے پر اتنے آدمیوں کو کچھ نہ کچھ مصروفیت نکل آتی ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ کہ اگر ایک پورا سماج مر رہا ہو تو اس کی موت کتنے آدمیوں کے لئے مصروفیت پیدا کر دے گی اور اس حساب کو ۳ سے ضرب دے دو۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمارے یہاں آج کل زندگی کے تین نظاموں کی موت واقع ہو رہی ہے۔

ایک نظام وہ ہے جو نہ جی رہا تھا نہ بالکل مر رہا تھا۔ یہ ہے غلامی کے عہد اور جاگیرداری کے عہد کے درمیان کی حالت جس میں کسان نہ محض غلام ہوتا ہے نہ لگان ادا کر کے اپنی زمین پر کاشت کا اور اپنی محنت کا پورا مالک و مختار۔ یہ نظام تو بس سمجھو کہ دم توڑ ہی چکا۔

دوسرا نظام ہے جاگیرداری۔ اس کو انگریز نے انجکشن دے دے کر زندہ رکھا۔ اور حق یہ ہے کہ موصوف نے بہت طویل عمر پائی۔ مغربی یورپ کی ٹھنڈی آب و ہوا میں بھی ان کا ہم عمر کوئی نہ ہوا۔ مگر ہمارے یہاں کی گرم آب و ہوا میں انگریزی انجکشنوں کا اثر الٹا ہو گیا۔ ان کی بدولت یہاں جاگیرداری عہد اندر سے گھل جانے کے باوجود اب تک اپنا وقار اور اپنا بھرم بنائے ہوئے تھا۔ دیسی سرمایہ داروں نے آتے ہی موصوف سے کچھ منافقت

برتی۔ کچھ کچھ صلح، کچھ کچھ عداوت۔ کچھ اقرار، کچھ انکار۔ جہاں دیکھا
اتحاد سے کام چلتا ہے وہاں اتحاد کرلیا، اور جہاں دیکھا کہ ان کا
وقار وسیع سرمایہ داری کو پنپنے سے روکتا ہے وہاں دوستی کے
پردے میں ان کی شان کرکری کردی۔ آخری عمر کا یہ صدمہ
موصوف سے سہا نہ گیا اور اب وہ بھی الٹی سانسیں لے رہے ہیں
سرہانے "پریوی پرس" رکھی ہے۔ جنازہ دھوم سے نکلے گا

تیسرے[۳] نظام کی موت "مرگِ انبوہ جشنے دارد" والا
قصہ ہے۔ یہ سرمایہ داری ہے جسے جوان ہونے سے پہلے پھیپھڑوں
کی دق اور موسم کی ناسازی کھا گئی۔

سرمایہ داری غریب نے ابھی شباب بھی نہیں دیکھا تھا کہ معاشی
سنکٹ (کرائسس) نے اسے دبوچ لیا

اس نوجوان مرگ کی موت واقعی دردناک اور ہیبت ناک ہے
یہ تینوں نظام مر رہے ہیں۔ پہلے کی ارتھی کسی جارہی ہے۔
دوسرے کے سرہانے یٰسین پڑھی جارہی ہے۔ تیسرے کو جاں
کنی کی آسانی اور سنبھالا دینے کے لئے انجکشن دیے جارہے ہیں۔
ان تین موتوں نے کتنے بہت سے آدمیوں کو روزگار مہیا کر دیا ہے
جب میں سوچتا ہوں تو لکھو کھا آدمیوں کا ایک ہجوم میری آنکھوں کے
سامنے گھوم جاتا ہے۔ جو تین بڑے بڑے تاریخی نظاموں کی موت

اور آخری لمحات کی مصروفیتوں میں لگا ہوا ہے۔ اور قدرتی کاموں کا پٹرا ہو رہا ہے۔

یہ زمین کا لمبا چوڑا رقبہ ہے۔ اگر حالات مناسب ہوتے تو یہاں دھان کے کھیت لہلہا رہے ہوتے، اور بچے اُن میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہوتے۔ اور اب کیا ہے؟ پانچ عمارتیں، تین جھونپڑے ایک کھیت لُٹا پٹا۔

ایک عمارت پیر صاحب کا مزار ہے۔ دوسری عمارت سینی ٹوریم۔ تیسری عمارت بظاہر خالی۔ اندر گودام۔ چوتھی عمارت کرایہ داروں کے لئے وقف۔ پانچویں عمارت یتیم خانہ اور وِدھوا آشرم، پیر صاحب کا مزار یہاں اس لئے قائم ہوا کہ آس پاس کے علاقے میں کسی بزرگ کا مزار نہیں تھا۔ مزار قائم ہوا تو مجاور آئے۔ مجاور آئے تو زائرین آئے زائرین آئے تو ان کے ہاتھ سودا سلف بیچنے والے آئے، ان کے بعد پیر صاحب اور ان کے حالات کی تاریخیں اور قصیدے سنانے والے، پھر قوّال آئے، پھر ہار پھول، اگربتی والے پہنچے، پھر گلے میں مالائیں ڈال کر راستے پر بیٹھنے والے پہنچے، پھر قسمت کا حال بتانے والے بھی آ گئے۔ پھر پیر صاحب سے ضرورتمندوں کی سفارش کرنے والے پہنچے۔ پھر ان سفارش کرنے والوں کے تازہ مریدوں نے ڈیرا

ڈال دیا۔ پھر تمنّاؤں سے بھرے ہوئے جوان دِل پہنچے اور دُکھی عورتیں لڑکیاں پہنچیں، پھر دونوں کا جوڑا بٹھانے والوں نے خیمے لگا لیئے۔ پھر وہ آئے جو "عشرت" یا یک گونہ بے خودی" کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ پھر وہ جو اس سامان کی نگرانی کرتے ہیں۔ پھر وہ جو مزار کے باہر والے دروازے سے زائرین کے جوتے چراتے ہیں۔ پھر وہ پہنچے جو دوسروں کے جوتوں کی حفاظت کے لئے قینچی لیئے بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر وہ جوان سب کا کھوج لگاتے ہیں۔ پھر پولیس والے کہ کسی کو ان کے بارے میں گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں، پھر یہاں چور بازار کا مال بیچنے والے، اور ان کے فوراً بعد چور بازار کے لئے "مال" خریدنے اور پہچاننے والے آگئے۔ آبادی بڑھتی گئی۔ روزگار پیدا ہوتے گئے۔

اس طرح ایک مزار سے نہ جانے کتنے سو آدمیوں نے اپنا روزگار پیدا کرلیا ہے۔ اسی طرح یہ دوسری عمارتیں ہیں۔ ہر ایک سے بے شمار روزگاروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

یہ سیبی ٹوریم ہے؟ اس کے اندر آتشک اور سوزاک کے مریض اپنا تحفہ دوسروں کو تقسیم کرنے آئے ہیں۔ شہر کے ہنگامہ خیز کاروبار سے فرصت حاصل کرکے وہ یہاں ہر دوسرے تیسرے مہینے مہمان رہ جاتے ہیں۔

یہ یتیم خانہ۔ یہاں کچھ یتیم پالے جاتے ہیں۔ یتیم الاخلاق اور یتیم العقل لوگوں کے حوالے کر دینے تک۔ اس سے بھی شہر کے کئی دلاّلوں نے اپنا روزگار وابستہ کر لیا ہے

یہ بڑا سا احاطہ۔ جو اکثر لوگوں کے بے گھر ہونے پر بھی آج خالی پڑا ہے۔ کبھی کبھی چوری کے مال اور چور بازار کے اناج یا کپڑے سے بھرا ہوا بھی ہوتا ہے، اور کئی آدمیوں نے اس سے اپنا روزگار وابستہ کر رکھا ہے۔

کرایہ دار؟ ہاں ان نوجوانوں میں سے کچھ ایسے ہیں جنھیں شراب کی بھٹی چڑھانے کا پورا نسخہ یاد ہے اور پولیس کو چکمہ دینے کی تدبیریں بھی۔

ایسا نہ ہوتا۔ مگر اور ہوتا بھی کیا۔ ان کرایہ داروں کو سینی ٹوریم یتیم خانے، مال گودام اور خاص طور سے پیر صاحب کے مزار نے پیدا کیا ہے اور پالا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور ہر ایجاد کئی روزگاروں کی دایہ۔

تین جھونپڑوں میں ایک جھونپڑا۔ جس کے آگے چمن جیسی کوئی چیز ہے۔ ایک کلرک کا ہے جو دفتر سے چھٹنی پر نکالا گیا ہے۔ بے روزگار ہوگا آجکل۔ دوسرے دو جھونپڑوں میں ایک چپراسی کا خاندان ہے، دوسرا ریلوے مزدور کا۔ دونوں گھروں میں بدحالی ہے۔

دیکھیے، ان میں سے کون کون نکل کر چوتھی عمارت کے کرایہ
داروں میں پہنچتا ہے

ایک جو کھیت ہے وہ یہاں ایسے وقت سے چلا آتا ہے کہ کسی کو
یاد نہیں کب سے۔ نہ جانے زمین کا یہ ٹکڑا اب تک کتنے
بے روزگاروں کو جنم دے چکا ہے۔ اور ان میں سے کتنوں نے
نیا روزگار پیدا کر لیا ہے۔

جب ان چار پانچ عمارتوں نے اتنے بہت سے روزگاروں
کا راستہ پیدا کیا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اور جو عمارتیں پٹی
پڑی ہیں۔ اسٹاک اکسچینج سے لے کر جیل خانے تک۔ ان میں
نئے نئے روزگار پیدا کر لینے کی کتنی گنجائشیں ہوں گی۔

دور دراز کے دیہات سے لے کر بڑے شہر کے بیوپار مرکزوں تک
ایسے ایسے روزگار پھیلے ہوئے ہیں جن کا نام رکھنے کی بھی رسم ادا
نہیں ہوئی۔

میں کتنے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا روزگار ہے نقلی دوائیں
تیار کرنا اور ان پر اصلی لیبل لگا کر سپلائی کرنا۔ اور پھر اسی ایک
روزگار کی شاخیں ہیں جن کا ایک سرا دوکان داروں سے، دوسرا
سرکاری آدمیوں سے ملتا ہے۔

میں کتنے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا روزگار ہے سٹّہ لگانا، اور سٹّے کی بولی لینا۔ اور پھر یہ روزگار بھی شاخ در شاخ چلا گیا ہے۔

کتنے لوگ ہیں جن کا روزگار ہے دولت مندوں سے روحانی علاج کے سرٹیفکیٹ لینا اور غریبوں کو یہ سرٹیفکیٹ دکھا کر اپنا مریض بنانا۔

میں کتنے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا روزگار ہے بے روزگاروں کو روزگار دلوانا۔ ان سے فیسیں وصول کرنا، اور خود کو عدالت سے بچائے رکھنا، یہ بھی ایک روزگار ہے

کتنے آدمی جاگیرداروں، اور زمینداروں کے سرھانے یسین پڑھنے کے روزگار میں لگے ہوئے ہیں کتنے جو کل تک ان کے مصاحب اور جاں نثار تھے (ان میں کسانوں پر حملہ کرنے والے بھی شامل ہیں) آج انھیں آخری بار ٹھگ لینے کے روزگار کو اپنا کر بیٹھ گئے ہیں۔

کتنے لوگ کلبوں میں رمی اور فلیش کے روزگار سے ایسے مطمئن ہیں کہ جیسے کچھ ہیے۔

کتنے ہیں جنھوں نے عام بے روزگاری کا ماتم کرنے، چندے وصول کرنے اور قرض لینے کا روزگار دریافت کر لیا ہے۔

کتنے لوگ ہیں کہ جب وہ کوئی نیا روزگار پیدا نہ کر سکے تو انھوں نے برسر روزگار دوستوں کے سامنے اپنی بے روزگاری کو اس طرح پیش کیا کہ وہ خود ایک روزگار بن گئی۔

کتنے لوگ ہیں جن کا روزگار اس سے وابستہ ہے کہ چلتے ہوئے روزگار بند ہوجائیں مگر ایسا روزگار دریافت کرنے کے لئے نظر رکھنے اور خطرہ سہنے کی ضرورت ہے۔ بمبئی اور مدراس میں شراب بندی ہوجانے سے کچھ لوگ ضرور بے روزگار ہوئے مگر ان سے زیادہ لوگوں نے اسی روزگار کے خاتمے سے نئے روزگار پیدا کرلئے جن لوگوں کو یہ روزگار بھی پسند نہ آئے انھوں نے گروہ بنا لیئے اور پیدل ہزار ہزار میل کا سفر کرکے دس دس قدم پر نمازیں اور درود پڑھنا شروع کردیا۔ اس طرح ایک ایسا روزگار پیدا ہوگیا جس کا پہلے سے کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔

اور غرض ایسے ہی ہزاروں روزگار نکل پڑے ہیں۔ دو[۲] سماج اور دو[۲] نظام بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ تیسرے نظام کے آخری دن ہیں۔ تین[۳] تین[۳] موتوں نے کتنے لوگوں کو کام سے لگا دیا ہے۔ حساب مشکل ہے۔

جب لوگ کہتے ہیں بے روزگاری عام ہو رہی ہے، تو میں سوچتا ہوں یہ بات بلاشرط نہ کہنی چاہیئے۔ بے روزگاری صرف اُن لوگوں میں عام ہو رہی ہے جو ایمان داری سے کچھ روزگار کرنا چاہتے ہیں۔ جو محنت سے روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ ورنہ ویسے دیکھو تو روزگار کی کیا کمی ہے۔ اُس مالک کا احسان ہے بھائی

اپریل سنہ ۵۲ء

اُتّر دیس

اُتّر دیس کے کھلیانو
تمھاری سنہری دَھرتی سے مجھے سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے
گنگا اور جمنا کی پوِتر وادی
تیری کوکھ نے اونچی مونچھ والے سپوت جنے ہیں۔
رام اور لچھمن کی ماتا
تیرے لاڈلوں نے ہزاروں راونوں کا سر کچلا ہے
سورما جاٹوں اور گوجروں کے میدانو
ہرے بھرے گیہوں اور گنے کے کھیتو
تمھاری چاہ سے میرے سینہ میں حرارت ہے
تمھاری یاد سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے۔
میری گردن اونچی ہے
میرے چہیتے وطن
آ — تیری ریشمی مٹی کو آنکھوں میں بسالوں
تجھے میری آنکھوں میں جگہ ہے۔

میرے پیارے وطن اُتر دیس
میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں
مگر تجھے کیا ہو گیا ؟
دیکھ تو سہی
یہ ہزاروں سال کے کچلے ہو دراوڑ
آندھرا، تامل ناڈ اور کیرالا کے بیٹے
جیون اور سنسکرتی کے سنگھرش میں تجھ سے آگے جا رہے ہیں
کل مرا ٹھے سندھ کے پانی سے اپنی برسوں کی پیاس بجھانے چلے تھے
آج دکن کا جوان اور صالح خون دلّی کی راجدھانی تک آ پہنچا ہے
ظلم اور جبر کے منھ پر طمانچہ مارنے،

انقلاب اور آزادی کی دوڑ میں
وطن اور تہذیب کے بچاؤ میں
علم اور فن کے مقابلے میں
جنوبی ہند کے دستے
بھری ہوئی کلائیاں تانے بڑھ رہے ہیں
پڑوسی چین کے انقلابی جوان
اتّر سے دکّھن فتح کرتے بڑھے تھے۔

بھارت ماتا کے نئے سُورما
کیا دکھن سے اُترّ فتح کرنے نکلیں گے ؟
میرے چہیتے دیس !
کیا یہ جھنڈے انھیں کے بازوؤں پر سجتے ہیں ؟
وقت ابھی گیا نہیں
بتا تیری مرضی کیا ہے

گنگا اور جمنا کے پیارے سنگم
وِدّ دانوں کے راج دلارے سنگم
تاریخ کے گہوارے اُترّ دیس
انگڑائی لے کر اٹھ
کرشنا اور کاویری کے دھارے جوش مار رہے ہیں۔
میرے دیس !
جی نہیں مانتا کہ تیرا خون سرد ہوگیا
میں تجھ سے نراش نہیں ہوں میرے پیارے

۳۰ر دسمبر ۱۹۵۱ء

"میں اور اندیشہ ہائے دُور و دَراز"

جب میرا بچہ استعجاب اور جستجو کے جذبے کے ساتھ پوچھتا ہے،

"اچھا تو چاند میں کون رہتا ہے؟"

جب ساغر نظامی کی بچی میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھ سے فرمائش کرتی ہے،

"اَن کل۔ انگریزی میں ایک گیت لکھ کر سنا دیجئے ہمیں؟"

جب کالیہ کا چندر موہن مجھ سے کہتا ہے،

"یہ ہوائی جہاز کیسے اُڑ جاتا ہے۔ ہمیں سیر کرا کے لاؤ"

اور جب ننھے ننھے پیارے بچے ایسے سوال کرتے ہیں جن کا جواب مجھ سے بن نہیں پڑتا تو میں شرما کر اُن کے لب چوم لیتا ہوں۔

اکثر میں نے سوچا ہے کہ وہ وقت آ رہا ہے جب اِنہی لبوں سے میں ان سوالوں کا جواب سنوں گا، اور وہ جواب بھی سُنوں گا جو آج تک کی کتابوں میں کہیں نہیں لکھا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ اگلی نسل ایٹمی قوت کے عام استعمال کے دور میں ٹھاٹھ کر رہی ہوگی۔ اس کے

علمی خزانے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہوں گے، تعلیم، تفریح، تربیت، تحقیق، دریافت، تصنیف اور تالیف کی رفتار تیز ہو چکی ہوگی اور سوجھ بوجھ کا معیار اونچا ہو گیا ہوگا۔

اس نئی نسل کا مستقبل روزمرّہ کے واہیات خطروں سے پاک ہوگا، معاش کی طرف سے بے فکری ہوگی۔ کام میں سنجیدگی اور جولانی ہوگی، اور ہماری جوان بیٹیاں اور بیٹے، ہم بوڑھوں سے کہا کریں گے۔

"ڈیڈی۔ آپ لوگ اپنے زمانے میں یہ کیا آڑکباڑ لکھا کرتے تھے؟ تعجب ہوتا ہے کہ لوگ اِن اَدنا درجے کی چیزوں کو برداشت کیسے کرتے ہوں گے؟

اور آپ لوگوں کی "تصانیف عالیہ" کو پیپرویٹ بنانے کے بجائے زیر مطالعہ کیوں رکھتے ہوں گے۔

"اب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ لوگوں کو انقلاب لانے میں اتنی دیر کیوں لگی؟

فارمولا پسندی

بعض لوگوں کو جب میں بات بات پر فارمولا چسپاں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کاٹھ کا وہ گھوڑا یاد آتا ہے جس پر بچوں کو چڈھی کھلائی جاتی ہے۔

انتظار کھینچنا

انتظار کی لذت اور کرب کو سب مانتے ہیں
انتظار بہتوں نے کیا ہے
کسی نے موت کا، کسی نے زندگی کا
لیکن انتظار، انتظار میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے
آج طویل انتظار کے عالم میں جب وہ دھم سے آگئیں تو مجھے یہ خیال گزرا
انتظار میں نے بھی کئے ہیں، اور مختلف لوگوں کے لئے کئے ہیں۔
لیکن ایک تو انتظار وہ ہوتا ہے جس کے دوران بے چینی ہے
اور خاتمے پر تکلیف ورنہ تسکین
لیکن ایک انتظار وہ ہے جس کے دوران بے چینی اور لذت ہوتی ہے،
اور خاتمے پر تسکین اور لرزش۔
یہ انتظار کی دوسری قسم صرف محبوبوں کے لئے وقف ہے۔
وہ محبوب جن میں جسم ایک جنسی کشش بھی محسوس کرتا ہے۔
جنسی تعلق، خواہ اس نے عملی شکل اختیار کی ہو یا نہ کی ہو۔
ورنہ انتظار کے بعد کسی کے آجانے پر دل دھڑکنا کیا معنی

تسکین اور لرزش یا اضطراب ایک ساتھ
دونوں تضاد ایک وقت میں
یہ دونوں متضاد کیفیتیں گویا بجلی کے دو تار ہیں جو ایک ساتھ مل کر
مکمل ہوتے ہیں۔
ایک مثبت ، ایک منفی۔
جب میں ان کا انتظار کھینچتا ہوں
اور وہ کھنچی چلی آتی ہیں۔
تو ایک تسکین سی محسوس ہوتی ہے
اور لمحہ پاؤں پھول جاتے ہیں
دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔
اور دونوں متضاد تاروں کے ملاپ سے حیاتِ تازہ محسوس ہوتی ہے۔

۳ر اکتوبر سنہ ۵۰ء

کلچر

جہاں ابن آدم کو محض عقائد کی بنا پر مقبول و مردود بنایا جاتا ہو
وہاں کلچر پر جو کچھ بیت جائے کم ہے
کلچر تو خود کو نظم و ضبط میں رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

بُت گری

محرّم کی آج پہلی تاریخ ہے۔
اب دس دن تک امام حسین کی یاد تازہ کی جائے گی۔
بعض وہ لوگ بھی اس میں شریک ہوں گے جو حسین کو امام نہیں مانتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو اسلام کو سچّا مذہب نہیں سمجھتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو ان عقائد کو مانتے ہیں جنھیں اسلام توڑنے آیا۔
اور بعض ایسے لوگ بھی جن کی زندگی حسین کے مشن کی مخالفت پر بسر ہوتی ہے۔
حسین اُن خوش نصیب شہیدوں میں ہیں کہ ان کی یاد تیرہ سو سات برس سے منائی جا رہی ہے۔
میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کیا ہے؟

حسین کی شہادت اسلام کی تاریخ کا بڑا واقعہ ہے۔
لیکن میلاد النبیؐ یا اعلانِ نبوّت سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔

پھر اس کی یادگار میں یہ اس درجہ ہمہ گیری کیوں چلی آرہی ہے؟
کیا اس لئے کہ انسانی سماج صدیوں سے مظلوم چلا آرہا ہے
اور مظلوم کو مظلوم سے ہمدردی ہوتی ہے؟
مگر یہاں تو ظالموں کو بھی، میں دیکھتا ہوں کہ حسین کی یادگار منانے
میں آگے آگے ہیں

میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کھلا ہوا ہے
اس کا راز ہے وہ تام جھام، وہ میلہ اور جھمیلا جو محرم کے دنوں
سے وابستہ ہوگیا ہے
مجلسیں، تبرک، نوحے، سوز، ماتم، جھولا، ذوالجناح، تابوت
تعزیہ۔ سبیلیں، اور جشن

دُنیا میں کئی مذہب ایسے آئے جنھوں نے رائج الوقت "مائی تھولوجی"
(ضمیات) پر حملہ کیا۔
بدھ اور مہاویر سے لے کر محمد عربی تک
یہ لوگ اپنے زمانے کی بُت پرستی اور اس کی افسانہ تراشیوں اور
رسوم سے بیزار تھے
مہاویر تو اتنے بے زار تھے کہ انھوں نے خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا

لیکن انجام ؟

انجام یہ کہ اب سب کے پاس بُت گری کی الگ الگ
شکلیں موجود ہیں

اسلام نے بت گری اور اس کی افسانہ تراشی اور تمام جھام
کا سخت مقابلہ کیا تھا۔

ایسا سخت مقابلہ کہ دشمن کے خیمے کی طنابیں تک کاٹ ڈالیں
غنا، رقص، موسیقی اور مصوری، سب حرام

لیکن انجام ؟

انجام یہ کہ غنا اور موسیقی نے سوز اور نوحے کی صورتیں نکال لیں
رقص نے ماتم کا روپ دھار لیا

مصوری نے تابوت، ذوالجناح اور عَلَم پر کمال فن دکھایا
اور واقعہ کربلا کی داستان مہابھارت کے افسانہ سے زیادہ دلچسپ
بن گئی

اور اسلام نے اپنی "مائی تھولوجی" کا ایک باب اور کھولا
ستّر ہزار حوروں اور زمرّد کے ستّر ہزار محلوں میں وہ کشش
نہیں ہے جو یہاں ہے

سوا نیزے پر آفتاب اور بال سے باریک پُل صراط میں وہ
عبرت نہیں جو یہاں ہے۔

اب بے چارے بُت کیا طعنہ دیں گے کہ اسلام بالکل "خشک" ہے
اسلام کے پاس تو بڑھتے بڑھتے "مائی تھولوجی" کا حیرت انگیز ذخیرہ پیدا ہوگیا
جوشؔ نے کیا برا کیا جو یہ کہہ دیا ہے

جسے ارباب مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آب صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی

سچ پوچھو تو مذہب کی عمارت اگر کھڑی ہے تو اس میں افسانہ و رسوم و روایات کی اینٹیں چنی ہوئی ہیں۔
ورنہ آدمی سیدھے سادے عمل کی بے کیفی اور سنجیدگی پر صدیاں کیسے گزار سکتا ہے۔ کچھ تو چاہیئے جی بہلانے کی باتیں۔

نومبر ۴۹ء

الارم

سوچا تھا کہ صبح بیدار ہونے کے لئے ٹائم پیس میں الارم بھر کر رکھا کروں گا
لیکن آج تجربہ نے بتایا کہ نیت بخیر ہو تو الارم بھرنے کی ضرورت نہیں
صبح سویرے جگانے کو تو فقیروں کی صدائیں بہت ہیں۔
یہ صدائیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔
ہمارے ملک میں دن شروع ہوتا ہے بھیک کی آوازوں کے الارم سے۔
اور ایسے بھی بہرے ہیں جنھیں خطرے کا یہ الارم سنائی نہیں دیتا۔

۶ر اگست

رات سیاہ اور بادل سیاہ تر ہیں
دیر سے رِم جھم ہو رہی ہے
بادِ بہار کے جھونکوں سے کھڑکیوں کے پردے اُڑے جا رہے ہیں
ہائے کیا ستم ہے ؟
مجھے کب خبر تھی
میں بھری برسات کے یہ دن ٹال کر پھر کبھی اُن سے مل لیتا ۔
بھری برسات کی ملاقاتیں
اور آج ان ملاقاتوں کو زمانہ گزر گیا

کاش سچ مُچ زمانہ گزر گیا ہوتا
بادِ بہار کے جھونکوں نے
کھڑکیوں کے پردے اور یادوں کے ورق اُلٹ دیے ہیں ۔

رِم جھم ہو رہی ہے ۔

ہر شے دُھل دُھلا کر نکھر گئی
زمین نے اپنی پیاس بجھالی
اور تپتے ہوئے سینے کی پیاس اور بڑھا دی
بیل بوٹے تو ہرے ہوئے تھے
لیکن بادِ بہار کے جھونکوں نے
سوکھے ہوئے زخم بھی ہرے کر دیئے
ہائے کیا ستم ہے؟
مجھے کب خبر تھی

۶؍اگست سنہ ۴۹ء

ایمان بالغیب

اس لفظ کا مطلب یہ ہونا چاہیئے
کہ جو آج غیب ہے وہ کل ظہور میں آکر رہے گا۔
اور غیب و ظہور کی یہ ترتیب کبھی ختم نہ ہونے پائے گی
یعنی زندگی کا سلسلہ لافانی ہے
اس پر ایمان لاؤ میرے بھائیو!

پہلی رمضان سنہ ۱۳۶۷ھ

رات

اس نے زندگی کی آدھی راتیں جیل میں گزاری ہوں گی
عمر ہوگی یہی کوئی پندرہ سولہ برس
مسیں بھیگ رہی تھیں
اس کا نہ کوئی ٹھکانہ تھا، نہ ماں، نہ باپ، نہ کوئی سرپرست
آوارہ گردی کے جرم میں جیل جانا اور باہر آکر مزدوری پر رکشا کھینچنا اس کا پیشہ تھا
رکشا سائیکل سے بڑھ کر اسے کسی کی محبت نہ ملی تھی۔
رکشا سائیکل پر وہ ایسے پیار سے ہاتھ پھیرتا تھا جیسے وہ سائیکل نہیں اس کی تمنا ہو

پولیس کے دو سپاہیوں نے اُسے پھر پانچویں بار مجسٹریٹ کے سامنے دھکیلا
مجسٹریٹ نے پولیس کا پیش کیا ہوا الزام نامہ دیکھا۔
"ہوں ــــ عادی مجرم ہے"
"پچھلی سزا کا کوئی اثر نہیں ہوا اس پر"
"حضور میرا کوئی قصور نہیں ــــ حضور میں ــــ حضور۔ میرا کوئی"
"تین مہینے قید بامشقت ڈھائی سو روپیہ جرمانہ۔ عدم ادائیگی پر ۳ مہینے اور"

اسی الزام پر "عدالت نے" جو سزا پہلے دی تھی اب کی بار دگنی کر دی گئی
اس کی آہ و زاری کسی نے نہ سُنی
وہ جیل میں پہنچا دیا گیا چھ مہینے کے لئے
وہ، جس کے ناز کسی نے نہ اُٹھائے تھے

دونوں وقت مل رہے تھے کہ وہ شام کا کھانا کھا کر سو گیا اور صبح تک سوتا رہا۔
جیل کے محافظوں کی رات بھر کی پکار اسے لوریاں دیتی رہی
رات ایک مادرِ مہربان کی طرح اسے اپنی آغوش میں سلائے رہی۔
اور اس طرح رات کے نرم اور ممتا بھرے ہاتھ جیل کی سلاخوں کو توڑتے رہے
چھ مہینے کی سزا صرف تین مہینے کاٹنی پڑی
سزا کی آدھی میعاد رات کے مہربان قانون نے منسوخ کر دی۔
"عدالت" کے فیصلے پر رات کا فیصلہ حاوی ہو گیا۔

۳۰ جون سنہ ۵۲ء

آخری قانون

نظامِ کائنات کا آخری قانون؟
یہ ہے کہ کوئی آخری قانون نہیں

ایک اور ہی فکر

تم کہتے ہو کہ انقلاب کی راہ ہموار کرو
راہ ہموار ہو یا ناہموار، انقلاب کو تو بہر حال آنا ہے۔
لیکن مجھے ایک اور ہی فکر ستانے لگی ہے
اگر نسلِ حاضر کے جیتے جی، یہ کمیونسٹ سماج ساری دنیا میں قائم ہوگیا۔ تو ہمارے ان دوستوں پر کیا گزرے گی جن کی خُو بُو میں "انارکی" بس گئی ہے۔ اور جو "بوہیمین" طریقِ زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔

"انارکی" کتنی ہی مجہول سہی مگر ہے کم بخت عجب چیز۔ اس کی لذت یا اس کے خمار کا اندازہ ابھی نہیں ہوتا کیونکہ یہ پورا سرمایہ داری کا نظام، جس میں ہم تم جیتے ہیں، "انارکی" بوہیمین ازم اور بے نظمی سے بھرا پڑا ہے اور وہ جو شا نے کہا کہ "جب پانی تمہارے منہ میں بھرا ہوا ہو، تم اس کا ذائقہ کیونکر بتا سکتے ہو؟" بس وہی قصہ ہے یہاں۔
کہیں وہ وقت نہ آپڑے کہ ہمارے اکثر دوست چاہیں بھی تو

"انارکی" کی لذّت سے محروم رہ جائیں۔ کیسی انتہا محرومی
ہوگی یہ ہم لوگوں کے لئے جن کی آدھی عمر اسی "انارکی" کے بازار
میں دوکان لگاتے لگاتے بسر ہوگئی ہے۔
بھری پُری جنّت میں جو حشر "بھلے مانسوں" کا ہونے والا ہے
وہ یہیں ہو جائے گا سچ مچ کی دنیا میں۔

میری مانو تو ایک کام کرو
دنیا بھر کو آزاد کرادو لیکن ایک آدھ پٹّی کوئی ایسی چھوڑ دو جہاں
ایک حلقے میں جاگیرداری، دوسرے میں سرمایہ داری کا بول بالا
رہے۔ اور سرمایہ داری کی تہذیب جوں کی توں سانس لیتی رہے
بھلے مانسو! ایک ہمارے لکھنؤ کا قیصر باغ، دوسرے ان کے
نیویارک کا وال اسٹریٹ اپنی اصلی حالت میں چھوڑ دو۔
کچھ لوگ وہاں "عبرت پکڑنے" اور کچھ ہوا کھانے ہو آیا کریں گے۔
تم کہوگے کہ "انارکی" کی تہذیب ہو، یا قیصر باغ، یا وال اسٹریٹ
ذاتی منافع خوری کے نظام کی پیداوار ہیں۔ وہ نظام ٹوٹے گا
تو یہ سب آپ سے آپ ختم ہو جائیں گے
اور تم کہوگے کہ یہ تو انقلاب دشمنی کا مطالبہ ہے
ہائے میرے دشمنو! تم تو مانتے ہی نہیں

۱۷ر دسمبر ۴۹ء

ذہنی تخلیہ

یہ تم کیا غضب کر رہے ہو بھائی!
دوستی بھی کچھ حدود چاہتی ہے۔ حدود نہ توڑو
جن دوستیوں کو تم نے قربانی دے کر پایا ہے وہ خطرے میں پڑ جائیں گی۔

ٹھیک کہا تھا اُس مرحوم نے کہ
"دوستی کا پردہ ہے بے گانگی"
خود کو دوستوں سے کافی لئے دیے رہنے میں غیریت کی بسا ند آتی ہے
اور غیریت کی بساند خلط ملط ہونے کی راہ میں حائل رہتی ہے۔
دوستی کو بھرپور نہیں ہونے دیتی
لیکن خلط ملط ہونے کی وہ انتہا جہاں حدود نہ رہیں دوستی کی مرگِ ناگہاں لاتی ہے
شکر اگر اپنا وجود کھونے پر تیار نہیں ہے تو اُسے دودھ میں گم نہ ہونا چاہیئے
دو گھلے ملے میاں بیوی بھی ایک دوسرے سے تنہائی میں کپڑے بدلتے ہیں
حالانکہ ایک کا جسم دوسرے سے راز نہیں ہوتا۔
اگر تخلیے کی یہ خواہش ختم ہو گئی تو سمجھو ملنے کی تمنا گئی۔

گنگا اور جمنا کے دھارے لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہیں
لیکن دونوں کی بانہیں الگ الگ نظر آتی ہیں

فرد جماعت کی ایک کڑی بن کر بھی انفرادی مذاق باقی رکھتا ہے۔
ورنہ وہ جماعت یک رنگ اور بالآخر بے رنگ ہو جائے گی۔
اور خود وہ فرد جماعت کو کچھ دیتے رہنے کے قابل نہ رہ جائے گا
یہی حال دو دوستوں کا ہے۔
دو نازک شیشوں کو ایک ساتھ پیک کرتے وقت درمیان میں کچھ حائل کر دینا چاہیے
ورنہ شیشے ٹکرا جائیں گے
اور ایک نہ ایک وقت ان میں سے ایک ورنہ دونوں ٹوٹ جائیں گے

آدمی ایک ذہنی تخلیہ چاہتا ہے
جو نہیں چاہتا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے
جس کا اپنا وجود بھی ہے وہ ذہنی تخلیے سے دست بردار نہیں ہوتا
جو ذہنی تخلیے سے انکار کرتا ہے وہ دوستی سے کھیلتا ہے جیسے بچے شیشے کے ٹکڑوں سے
کسی آبگینوں کو ٹکراتے ٹوٹتے دیکھ کر یہ راز میں نے جانا۔

۱۶ / اگست سنہ ۴۹ء

تولّا اور تبرّا

مجھے مولانا محمد علی جوؔہر سے نفرت ہوگئی
جس آدمی کا دسترخوان نواب رامپور کے خوان کی طرح سجتا ہو وہ بھوکے ہندوستان
کو کیا جانے گا۔

مجھے جوؔش ملیح آبادی سے نفرت رہی۔
جو شخص شام ہوتے ہی شراب وکباب میں غرق ہوجائے اُس کے دِل میں
انقلاب کا درد کیا خاک ہوگا۔

مجھے ان تمام انقلابیوں سے اُلجھن ہونے لگی
جو شارک اسکن کا سوٹ پہنتے ہیں، گولڈفلیک سگریٹ پیتے ہیں
اور دُکھی جنتا کی باتیں کرتے ہیں۔

لیکن میں اپنے آپ سے نفرت نہ کرسکا۔

حالانکہ مجھے بھی اعلادرجے کے لباس، اچھے کھانے، اعلاسگریٹ اور
سُتھرے مکان سے محبّت ہے
اور یہ محبّت مجھے دکھی جنتا سے رشتہ جوڑنے اور انقلاب کی تحریک میں حصّہ لینے
سے نہیں روکتی۔

عجیب بات

مجھے ایک دن برنارڈ شا نے چونکا دیا

اس نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا

میرے دل میں مزدور طبقے کو دیکھ کر ایک ہی جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں فنا کر دیا جائے

میں ان سے نفرت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ ایسے بن جائیں کہ اُن سے

محبّت کی جا سکے۔

ایک بڑی سچائی نے میرا سینہ کھول دیا

اُس نے مجھ سے کہا

ارے بے عقل! محبّت کا بیج نفرت کی زمین سے پھوٹتا ہے

توحید کا تصوّر "لا الٰہ" سے پیدا ہوتا ہے

اثبات کی حقیقت نفی کے بعد کھلتی ہے

جب تم باطل سے نفرت کرنے میں پختہ ہو جاتے ہو تو حق سے سچّی محبّت کی طرف بڑھتے ہو

وہ انگریزی اَدَب کی ایک شاہکار نظم تمھیں یاد ہے؟

ایک شخص جسے کنوئیں میں برسوں قید رکھا گیا۔ اس نے کنوئیں سے اپنے آپ کو مانوس کر لیا

وہ تاریک گھٹا ہوا ماحول اُسے راس آ گیا

اور جب اُسے رہائی کا پروانہ ملا تو گھٹے ہوئے کنوئیں کی محبّت نے اس کا دامن تھام لیا

اور اُجالے کی آواز اُسے نہ بلا سکی۔

تاریکی سے خود کو مانوس کر لینا، اجالے کی محبّت کے لئے زہرِ قاتل ہے
تاریکی میں رہ کر بھی اس سے مانوس نہ ہونا اجالے کی محبّت کے لئے امرت ہے
"یزیدیت" سے نفرت کرنا حسینیت کی محبت کو مکمل کرتا ہے۔
خوش حالی، پاکیزگی اور بلندی سے سچّی محبت وہی کرے گا جو بدحالی، گندگی
اور پستی سے متنفّر ہو۔
میرے بھائی، بُرا نہ مان، تبرّا ایک لازمی پہلو ہے تولّا کا۔

بھوکے ہندوستان کے درد کو محمد علی جان سکتے تھے
کیونکہ انھیں اعلا درجے کی غذا عزیز تھی، اپنے لئے بھی اوروں کے لیے بھی
افلاس اور عسرت سے نفرت کرنا جو خوش جانتے ہیں۔
کیونکہ انھیں عشرت سے بھرپور محبت ہے، عشرت جو ماحول کے بغیر نا تمام رہتی ہے
اور یہ مزدور بستیوں کی گندگی ہے
کہ ان انقلابیوں کے سینے میں انگارے دہکاتی ہے۔
جو سلیقے کے مکان اور ستھرے ماحول میں سانس لینے سے محبّت کرتے ہیں

یہ حسد ہے یا نادانی؟
کہ تم غریبوں کا درد رکھنے والوں کو صرف تباہ حال دیکھنا چاہتے ہو۔
تباہ حالی، گندگی، پستی، بدمذاقی، بدتمیزی اور بے حسی۔

انھیں ظلم اور جبر نے جنم دیا ہے
ان سے محض نفرت کی جاسکتی ہے۔
جہاں تک بن پڑے، ان سے نفرت کیے جاؤ
یہ نفرت مبارک ہے۔
اس سے انقلاب کی تمنا زندہ اور پائندہ رہتی ہے۔
پست حالی پر رضامند ہوجانا اور لوگوں کو رضامند کرنا سماجی جرم ہے۔
"ترکِ دنیا" کی تعلیم سے لے کر گاندھویت تک سب اس میں شریک ہیں
پہلے آگ بجھانے کے لیے مشکیں اوندھائی جاتی تھیں، اب فائر بریگیڈ بلایا جاتا ہے
تم نفرت کی آگ کو اور تیز کرو۔
تاکہ جڑی بوٹیوں کی غذا، ٹاٹ چھاپ کھدّر اور جھونپڑوں کی رہائش خاک کا ڈھیر ہوجائے
اگر انسانوں کی خوشحالی اور بہتر زندگی چاہتے ہو
تو پست حالی اور بے سلیقگی کو اختیار مت کرو
یہ — یا تو لوگوں کی بے بسی کا نشان ہے ورنہ ریاکاری کا ثبوت

۱۸ر نومبر سنہ ۴۹ء

جب تک اپنی جہالت کا احساس نہ ہو، علم کی طرف پائے طلب بڑھتا نہیں۔
میں سوچتا ہوں کہ جہاں جہالت کے احساس کی انتہا ہے وہیں سے علم کی ابتدا ہوتی ہے
یہ نکتہ ابو علی سینا سے میں نے پایا
جو اپنے علم کے جواہرات کو خزف ریزے کہتا تھا

مستان تالاب

میلے کچیلے اور اُجلے آدمیوں کا ایک ہجوم پھیلا ہوا ہے
میں اس ہجوم کے سامنے ایک کنارے پر بیٹھا ہوں
خیالات، قندیل کی کاغذی تصویروں کی طرح میرے دماغ کے فانوس پر
گزر رہے ہیں۔
میں سوچ رہا ہوں

یہ مستان تالاب کا میدان
جہاں ایک زمانے سے نہ کوئی مستان باقی ہے نہ تالاب
صرف ایک اکھاڑہ رہ گیا ہے
مستوں کا اکھاڑہ
کہتے ہیں اب سے دور کوئی مستان پیر تھے
جنھوں نے یہاں کبھی اڈّہ جما رکھا تھا۔
مگر یہ تالاب؟
تالاب سے پیر کو کیا واسطہ؟

پیر ہونے کے بعد تو نہانے دھونے سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جاتی ہے
ہو سکتا ہے مستان پیر والی روایت غلط ہو
ممکن ہے وہ پیپل والے سچ کہتے ہوں
جن کے مندر کو ایک اردو اخبار نے اپنا یتیم خانہ بنالیا ہے۔
اگرچہ اردو اخبار کا دفتر بھی کسی پیر کی خانقاہ سے کم نہیں ہوتا
ان میں کوئی فرق ہے تو خوش حالی اور بدحالی کا
پہلے کے حصّے میں اکثر بدحالی آتی ہے اور دوسرے کے حصّے میں خوش حالی

یہ مستان تالاب کا میدان
جو بوڑھے برگد کی طرح اپنے دراز ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے
یہ ایک بااخلاق میزبان ہے
جس نے ہر قماش کے مہمانوں کے لئے اپنا تبسّم وقف کر دیا ہے۔
اس نے اپنی حدوُد میں
فاقہ مستوں کے نعرے بھی سُنے ہیں۔
اور پیٹ بھرے لوگوں کی خرمستیاں بھی دیکھی ہیں
لیکن اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہ پڑی
زمانے کے گرم و سرد نے اس میں پہلے ہی بڑی سہار پیدا کر دی تھی۔
بھلا جس نے دن رات انھی بے نوا مکانوں کے درمیان رہ کر آدھی

صدی سے زیادہ عرصہ گزرا دیا ہو اس میں غم سہ لینے کا کتنا حوصلہ
پیدا ہو گیا ہو گا۔

مستان تالاب کے میدان نے
بہار و خزاں کے کتنے ہی موسم اُنھی محلّوں کے درمیان گزار دیئے۔
جن محلّوں میں بہار و خزاں کی آمد و رفت سے کبھی آہٹ نہیں ہوتی
بند اور تاریک مکانوں کی گھٹی ہوئی کھولیوں میں نئی نسل جنم لیتی ہے۔
جوانی کی تمنا کرتی ہے، بوڑھی ہو جاتی ہے۔
اور نئی نسل کو اپنی تمناؤں کا ورثہ دے کر سدھار جاتی ہے۔
مستان تالاب نے ان میں سے بہتوں کو اپنی گود میں کھلایا ہے۔
اور بہتوں کو کھیل کھیلنے کے لئے اشاروں سے بلایا ہے۔
اور بہتوں کو جوان ہونے تک اُن پھلوں کی طرح گلتے دیکھا ہے جنھیں کیڑا لگ جائے
میں سوچتا ہوں
مستان تالاب نے اپنے ان لاڈلے ہمسایوں کے لئے کتنے آنسو بہائے ہوں گے
اس نے اتنے آنسو بہائے کہ آنسو ہی خشک ہو گئے ہمیشہ کے لئے

مستان تالاب کی زبان کبھی مراٹھی تھی
پھر شمالی اور درمیانی ہند کے اُجڑے ہوئے باشندے آگئے۔

تو اس نے بول چال کی ضرورت سے اردو بھی سیکھ لی۔
پھر جب پیٹ بھروں کی خرمستی نے ہولناک فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکائی
تو اس کے مراٹھی بولنے والے پرانے ہمسایے گھر چھوڑ کر جانے لگے۔
مستان تالاب نے دردمند آنکھوں سے اُنھیں جاتے دیکھا
اور آہِ سرد بھر کر دم بخود ہو گیا۔
جانے والے چلے جاتے ہیں، نئی زمین پا لیتے ہیں اور نئے مشغلوں میں لگ جاتے ہیں
لیکن دھرتی کے دل میں ان کی جدائی کا جو گھاؤ لگتا ہے، وہ کبھی نہیں بھرتا
مستان تالاب کے دردمند سینے میں نہ جانے کتنے گھاؤ پیوست ہو چکے ہیں۔

میں مستان تالاب کے ایک کنارے بیٹھا ہوں۔
میری پشت پر لوہے کا جنگلا ہے۔
میدان میں ایک ہجوم ہے
ہجوم کے گرد بھی یہی لوہے کا قدِّ آدم جنگلا ہے۔
ہجوم کی موجودگی نے لوہے کے جنگلے کی اہمیت کم کر دی ہے
ورنہ کھلے ہوئے فراخ میدان کے قدموں پر ایک بھاری زنجیر پڑی تھی۔
مستان تالاب اِس زنجیر کی گرانی بھول جاتا ہے۔
جب تک اس کے سینے پر انسانی ہجوم کروٹیں لیتا رہتا ہے۔

مستان تالاب مسکراتا رہتا ہے
اس کی مسکراہٹ میں کبھی کبھی مجھے زہر خند بھی دکھائی دیتا ہے۔
مستان تالاب نے سالہا سال سے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔
اس نے یہاں رنگا رنگ ہجوم دیکھے ہیں۔
اس نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو ہر رنگ کے ہجوم میں نظر آجاتے ہیں۔
صرف رنگ بدل کر
مستان تالاب کی جہاں دیدہ بوڑھی آنکھیں
شاید انھی کے لئے ایک طنز آلود مسکراہٹ پیش کرتی ہیں

مستان تالاب
اپنی سیالی انگلیوں کے پوروں پر تاریخیں گن رہا ہے۔
وہ تاریخ جب تالاب کی جگہ میدان ہو گیا۔
اور مینڈکوں کی جگہ انگریز کی خیر خواہی کرنے والے بزرگ بولنے لگے۔
پھر وہ تاریخ جب موسم بدلا
خدّام کعبہ اور خدّام الحرمین دونوں حریفوں کے جلسے ہونے لگے۔
پھر خلافت کمیٹی نے اپنے اجلاس کئے
محمد علی آئے، شوکت علی آئے، گاندھی جی پہنچے، مدن موہن مالوی آئے
ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں۔ عبدالغفار خاں، حسرت موہانی

ہندو مسلم اتحاد، کانگریس، مسلم لیگ۔ خلافت کھدر، چرخہ، آزادی'
بدیسی مال کا بائیکاٹ' سب کی تجویزیں یہاں پاس ہوئیں۔
وہ تاریخیں جب ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا
پھر وہ تاریخ جب پرنس آف ویلز نے ہندستان کی زمین پر قدم رکھا
وہی تاریخ تھی جب مستان تالاب نے شعلہ بار تقریریں سُنیں
وہ تاریخ جب دونوں نے مل کر "سائمن کمیشن" کو للکارا۔
جب "سائمن کمیشن واپس جاؤ" کی پہلی آواز یہیں سے بلند ہوئی۔
جب کے ایف نریمان نے پہلی بار پبلک پلیٹ فارم سے تقریر کی۔
پھر جب آزادی کا دھارا کنارہ توڑ کر اُبلنے لگا۔
پھر وہ تاریخ جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی
اس دن کے ہجوم کا جوش وخروش مستان تالاب کبھی نہ بھولے گا۔
پھر وہ تاریخ جب ملک میں فرقہ وارانہ نفرت پھیلائی گئی۔
اور نہرو رپورٹ غرقِ آب کر دی گئی۔
پھر وہ تاریخیں جب یہاں مسلم لیگ نے اپنا مستقل ڈیرا ڈال دیا۔
پھر وہ تاریخ جب یہاں لاہور کی پاکستان والی تجویز کی حمایت ہوئی
پھر وہ دن جب قائدِ اعظم جناح نے پہلی بار یہاں تقریر کی۔
پھر جب انھوں نے "ڈائرکٹ ایکشن" کی حمایت میں دھواں دھار نعرہ لگایا
یہاں پہنچ کر مستان تالاب کی انگلیاں گِنتے گِنتے رک جاتی ہیں

مستان تالاب پھر تین سال بعد کی ایک تاریخ گنتا ہے۔
پہلی مئی ۴۹ء کا دن۔
اس روز یہاں کے نوجوانوں نے ایک لال پرچم یہاں لہرایا۔
اس پرچم پر ہنسیا ہتھوڑا بھی بنا ہوا تھا۔
ہنسیا، جو ہر کھیت اور ہر میدان کا پرانا رفیق ہوتا ہے۔
اور ہتھوڑا، جس کا فرض ہے ہنسیا کو ایک خاص طرز میں ڈالنا۔
مستان تالاب اس تاریخ پر چونک اٹھتا ہے۔
جیسے پیراہن یوسف کی مہک نے یعقوب کو چونکا دیا تھا۔
بعد کی تمام اہم تاریخیں انھی لوگوں سے وابستہ ہیں جنھوں نے ہنسیا ہتھوڑے کا پرچم لہرایا تھا
میں کان لگا کر سنتا ہوں، مستان تالاب کے سینے سے صدا اٹھتی ہے۔
میرے بچو! تم نے بوڑھے دل کا درد پا لیا ہے۔
میں تمھیں اپنی بہترین یادوں کا ورثہ سونپتا ہوں۔
دل کہتا ہے کہ تم کانپتے ہوئے ہاتھوں کی اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھو گے
میرے ہونہار بچو! زندگی نے جو دکھایا، میں نے دیکھا۔
تم نے میرے سینے کو روشن کیا، تم خوش رہو۔
مگر میں اس روشنی کی ایک ایک کرن بند کوٹھریوں کی تاریکیوں میں بانٹنے کے لئے بے چین ہوں۔ میری بات یاد رکھو
"روشنی وہ دولت ہے کہ جتنا اُسے بانٹو گے اتنی ہی برکت ہوگی"۔

تپسیا

(ایک حد تک "ریاضت" کے لفظ سے یہ مفہوم ادا ہوتا ہے)

میں آلی فنٹا کے جزیرے میں ایک پہاڑی غار کے اندر کھڑا ہوں
میرے سامنے سنگین اور متناسب مورتیوں کا ایک جمگھٹا ہے
میں ان عظیم مورتیوں کو تک رہا ہوں۔
مورتیاں میرے حقیر وجود کو تک رہی ہیں۔
حقیر وجود ــــــ جس نے آج تک کوئی ڈھنگ کی چیز پیش نہیں کی۔

میں سوچتا ہوں
وہ کون لوگ تھے خدایا؟
وہ کس فولادی مٹی کے پتلے تھے؟
جنھوں نے پہاڑ کے بلند بالا سینے پر انسانی فن کاری کے یہ گہرے نقش بٹھا دیے
وہ اپنے دو دو فٹ کے ہاتھوں سے پتھر ڈھوتے رہے
اپنی چھوٹی چھوٹی چھینیوں سے دیو قامت چٹانوں کا جگر کاٹتے رہے۔
پورے ایک ہزار سال تک۔
ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ
عمرِ عزیز کی ساری متاع ہتھیلی پر رکھے ہوئے

وہ فن کی خاطر تپسیّا کرتے رہے
انسانی محنت اور خلّاقی کے نمونے تراشتے رہے۔
پورے ایک ہزار سال تک
آج اُن کا نام بھی کسی کو یاد نہیں
لیکن ان کا کام ؟
انسانی تہذیب کے معماروں کو تپسیا اور ریاضت کی تعلیم دے رہا ہے
وہ کیسے عظیم لوگ تھے خدایا!
میں ان کی تعظیم کے لئے سر جھکاتا ہوں

۱۴ر فروری سنہ ۵۱ء

دانہ کونپل اور پھل

اس مسیحی صوفی، خلیل جبران نے خوب صورت بات کہی:
محبّت کی پہلی نظر
وہ بیج ہے جسے حسن و محبت کا دیوتا آسمان سے پھینکتا ہے۔
محبّت کا پہلا بوسہ
وہ کونپل ہے جو زندگی کی ٹہنی پر سب سے پہلے پھوٹی
اور وصال
محبّت کے درخت پر آیا ہوا پہلا پھل ہے

حیرت ناک

اُفوہ ! ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں !
جو کہتے ہیں کہ جس نظام میں خدا کی حکمرانی کا تصوّر نہ ہو
وہ نظام ترقی نہیں کر سکتا ۔
اور انسان بامروت، بااخلاق اور خوش اعمال نہیں ہو سکتا ۔
حالانکہ حقیقت اس کے برعکس نظر آ رہی ہے ۔

جن نظاموں میں خدا کی حکمرانی کا تصوّر باقی ہے
وہاں میں اکثر لوگوں کو دیکھتا ہوں ۔
جب وہ دوسروں کا گلا کاٹتے ہیں تو سوچتے ہیں
زکوٰۃ دے کر یا بقر عید کے دن ایک بکرے کا گلا کاٹ کر جرم سے بری ہو جائیں گے
جب اُن کا ضمیر ان سے جواب طلب کرتا ہے تو کہتے ہیں:
ابھی خدا آسمان پر ہے، جب زمین پر آئے گا دیکھا جائے گا ۔
یہ لوگ خدا کے زمین پر آ جانے سے ڈرتے ہیں
اور جو لوگ خدا کو زمین پر لائیں انھیں دہریہ یا کافر کہتے ہیں ۔
کیسی حیرت ناک بات ہے یہ !

۳ر اگست سنہ ۴۸ء

یہ لوگ

پنجاب کا بٹوارہ ہو چکا ہے

خون کے فوّارے اُبل چکے ہیں۔ خاندان، ہمسایے، محلّے اور یار دوست ایک دوسرے سے بچھڑ چکے ہیں، سڑکوں اور بازاروں کی ہیئت بدل چکی ہے، اور بدل رہی ہے۔

میں دو رنگ ریلوے لائن کی بچھی ہوئی قینچیوں کے درمیان کھڑا ہوں۔

میری پشت پر ریلوے اسٹیشن ہے۔

سامنے ورکشاپ ہے۔

قدموں کے نیچے لوہے سے جکڑی ہوئی زمین ہے۔

سر پہ ورکشاپ اور شوگر مِل کی چمنیوں کا دھواں ہے۔

میں خلاصی لائن جانا چاہتا ہوں جو ریلوے مزدوروں کی بستی ہے۔ خلاصی لائن سامنے ہے۔ پہلے وہاں مسلمان مزدوروں کی بڑی تعداد بستی تھی۔ ان میں سے اکثر میری جان پہچان رہی ہے۔ اب سُنا ہے کہ ان میں کچھ مارے گئے، کچھ لُٹ پٹ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اور بہت سے سرحد پار کر گئے، انھیں ویگنوں میں بھر بھر کر پاکستان لے جایا گیا اور وہاں اُنڈیل دیا گیا۔

میں سوچتا ہوں

خلاصی لائن جاکر کیا کروں گا۔ وہاں کی زبان بدل گئی ہوگی۔ پنجاب
اور سرحد کے لوگ ہوں گے۔ ان میں پہچاننے والی صورت شاید ہی
کوئی نظر آئے۔ شہر کی آبادی میں جب اَن جانی شکلیں اور اَن جانے
لباس نظر آتے ہیں تو خلاصی لائن کا حال تو اس سے بھی گیا گزرا ہو گا۔
دوپہر کو کھانے کی چھٹی ہو جاتی ہے اور ریلوں ورکارخانوں کے بھونپو کی آواز آتی ہے،
لوگ اپنے اپنے ناشتہ دان سنبھالے کارخانوں سے باہر نکلتے ہیں۔
اور اِدھر سے اُدھر میلے میلے چیکٹ کپڑوں میں لپٹے ہوئے انسان درختوں
اور دیواروں کے سایے میں ڈھیریاں بناکر بیٹھ جاتے ہیں۔
میں اپنی جگہ ٹھہر جاتا ہوں، ان میں جان پہچان کی شکلیں تلاش کرنے کے لئے۔
وہ آدمی جو اس کنارے پر ناشتہ دان کھول رہا ہے عبدل ہو گا شاید۔
میں بڑھتا ہوں۔ وہ عبدل نہیں ہے۔ کوئی گینڈا سنگھ ہے۔
ارے! رشید پاکستان نہیں گیا، وہ کیا بیٹھا ہے، اس درخت کے نیچے۔
میں اس طرف جاتا ہوں، رشید نہیں ہے ہزارہ کے کوئی نتھو رام ہیں۔
نتھو رام مجھ سے بات چیت کرتے ہیں۔
بات چیت، مزدور تحریک اور ریلوے مزدوروں کی مانگوں پر ہوتی ہے
میں بیٹھ جاتا ہوں اور تھوڑی دیر میں ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنا
پہچان لیتے ہیں گویا برسوں سے جانتے ہیں۔

میں بھول جاتا ہوں کہ وہ رشید نہیں ہے نتھو رام ہے۔
مجھے خیال آتا ہے کہ جس باہمت مزدور رشید کو میں تلاش کر رہا تھا وہ نتھو رام
کے اندر موجود ہے۔
میں دیکھتا ہوں کہ نتھو رام کے اندر عبدل بھی موجود ہے۔
پھر اور مزدور آس پاس کے آجاتے ہیں۔
گینڈا سنگھ بھی ـــــــ جن کا اصلی نام کچھ اور تھا، آجاتے ہیں۔
اور میں دیکھتا ہوں کہ نتھو، عبدل، رشید اور گینڈا سنگھ سب ایک ساتھ بول رہے ہیں
ان کی زبان ایک سی ہے
ان کا رجحان ایک سا ہے۔
ان کا کھانا اور ناشتہ دان ایک سا ہے
اور اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ ان کا لباس ایک ہے۔
سرحد تو "بنا دی شب بھر میں' ایماں کی حرارت والوں نے"
لیکن تہذیب کو کوئی سرحد نہ بانٹ سکی۔
لیکن طبقاتی مفاد کی حد بندی کے لئے باؤنڈری کمیشن نہ بٹھایا جا سکا

میں سوچتا ہوں
کیا رشید اور عبدل کے ساتھ میں یہی زبان نہیں بولتا تھا۔
کیا وہ دوسری اصطلاحیں ہیں جو نتھو رام اور گینڈا سنگھ بول رہے ہیں۔

یہ دھوئیں اور کوئلے میں اَٹے ہوئے بال
یہ مشینوں کے یک رنگ کئے ہوئے کپڑے
یہ محنت کے خمیر سے بنے ہوئے کھُردرے ہاتھ
یہ سب پہچانے ہوئے ہیں ۔ یہ سب ایک ہیں
نیل کا ساحل ہو یا ٹیمز کا ساحل
مزدور کا لباس ہر جگہ یوں ہی تیل اور پسینے میں بسا ہوا ہے ۔
گوری جلد کا مزدور ہو یا سیاہ چمڑی کا
دونوں کو مشین اور کوئلے نے ہمرنگ کر دیا ہے
یہ ہم رنگی صرف جلد کے اوپر نہیں، اس کے اندر بھی ہے
میری آنکھوں کے سامنے دور دراز ملکوں کے مزدور قافلے گزرنے لگتے ہیں
اور میں دیکھتا ہوں کہ یہ سب پہچانی ہوئی شکلیں ہیں ۔
ان کا رجحان ایک سا ہے ۔
ناشتہ ایک سا ہے، ناشتہ دان ایک سا ہے ۔ اور اُن کا لباس ایک ہے
میں دیکھ رہا ہوں کہ مزدور طبقے کی تہذیب ایک ہے ۔
جغرافیے کی حد بندیوں نے یہاں ہاتھ کھینچ لیا ہے ۔
اور طبقاتی یک رنگی نے اپنی بساط پر تمام محنت کشوں کو متحد کر لیا ہے
شیکسپیئر کا ایک جملہ مجھے ترمیم کے ساتھ یاد آتا ہے ۔
اتحاد! تیرا نام محنت کش طبقہ ہے ۔

۱۷ر نومبر ۴۷ء

تلاش

"بڑے میاں! کیا تلاش کر رہے ہو؟
کچھ کھو گیا کیا؟"
میں یہ اس آدمی سے پوچھنا چاہتا تھا جو مڑ مڑ کر اس گلی کو قدموں سے ناپ رہا ہے
سنا ہے یہ بوڑھا آدمی تیس ۳۰ برس پہلے یہاں رہتا تھا۔
وہ اس کی جوانی کے دن ہوں گے
پانچ قدموں میں پوری گلی کا فاصلہ طے ہو جاتا ہو گا۔
اور اب بیس ۲۰ قدموں میں بھی وہ فاصلہ طے نہیں ہوتا۔
وہ سوچ رہا ہے کہ کہیں یہ گلی تو اور نہیں بڑھا دی گئی۔
وہ مڑ مڑ کر اس گلی کو تیس برس بعد قدموں سے ناپ رہا ہے
بے چارہ اپنے پرانے محلّے کی خاک میں جوانی ڈھونڈھنے آیا ہے
مجھے بے اختیار (غالباً) مُتنبّیؔ کا شعر یاد آیا ؎

تَقَدَّم خُطُوًا اَوْ تَاَخَّرَ خُطُوا
فَاِنَّمَا الشَّبَابَ مَشَیٰ القهقری

{ چاہے قدم آگے رکھو یا پیچھے رکھو، کتنا ہی پس و پیش کرو
{ مگر جوانی تو اُلٹے پاؤں روانہ ہو گئی

۳ر فروری ۶۵۲

یادِ یار

اُن کی یاد آج کچھ بے طرح آئی

مجھے خیال آیا کہ دیکھو یادِ یار بھی کیا۔ ندِ بے پرواہ ہے
اس کی عنایتوں نے سبھی کو فیضیاب کیا۔

فیضؔ کہتے ہیں کہ اُن کی یاد ایسے آتی ہے
"جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے"

راشدؔ کو اس تلازم کے ساتھ کہ کسی ناؤ پر چلے جا رہے ہیں اُٹّل ٹپ
حسرتؔ بے چارے مہینوں تو سیاسی الجھیڑوں میں گھرے رہتے ہیں۔
اور پھر جب ان کی یاد آنی شروع ہوتی ہے تو اکثر آتی ہے کہیں
ترکِ الفت کا عہد کر لیا تو اور بھی زیادہ یاد کا دورہ ہوتا ہے۔
جگرؔ کو بھی اتفاق سے یاد آتی ہے۔ مگر چائے کی پیالی کی طرح آتی ہی چلی جاتی ہے
اختر شیرانیؔ کو ننھا قاصد دیکھ کر یاد آتی ہے اور پھر اس کے ساتھ پشیمانی بھی۔
جوشؔ کو بھولے بھٹکے سگار کی طرح یادِ یار آتی ہے۔
غالبؔ کو جب یادِ یار آتی ہے تو قیامتوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔
رودکیؔ کو وطن کے دریاؤں اور باغیچوں کے ساتھ

"یادِ یارِ مہرباں آید ہمی"
مومن کو یاد کے ساتھ ہچکی بھی آتی ہے

مگر میرؔ کو؟ ہائے، اس کی بات
چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

۳۱ر اکتوبر ۴۸ء

مولوی

یہ جمعیتہ العلما چھاپ کے مولوی
یہ "درس نظامی" حفظ کیے ہوئے مولوی
جنھوں نے سات دریا سات پہاڑ اور سات ملکوں تک جغرافیہ پڑھا ہے
اور ستر ہزار حور و غلمان کی جمع تقسیم تک علم حساب سیکھا ہے۔
اور خلافتِ عباسیہ تک تاریخ عالم یاد کی ہے۔
یہ بڑے مولوی
جنھوں نے قائداعظم کے صیغۂ نکاح اور رسمِ ختنہ تک ریسرچ کی ہے۔

میرے دوستو!

تم انھیں تحقیر سے نہ دیکھو

میں انھیں فرقہ پرستی اور ڈھل مُل یقینی کے طوفان میں چٹان کی طرح ثابت قدم پا چکا ہوں

ان کے عمل میں "صراطِ مستقیم" کی سی سیدھ رہ چکی ہے

اور "حبل المتین" کی سی استقامت۔

یہ اُن موقع پرست اور دغا باز ماہرینِ سیاست سے ہزار درجہ لائقِ احترام ہیں۔

جن کی قانون دانی اور سیاست فہمی

ان کے گلے میں رسّیاں ڈالے ہوئے سامراج کی آغوش میں لے گئی۔

جنھوں نے پیشہ ور وکیلوں کی طرح خطابت کے زور سے،

جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھایا۔

جنھوں نے تاریخ دانی اور ریسرچ کی قوت سے

تہذیبوں کو تہذیبوں کے خلاف صف آرا کر دیا

اور پودوں کو اُن کی جڑوں سے اکھاڑ لیا۔

اور کھدّر میں ڈھکے ہوئے مہاجن!

تو مولوی کو کس منہ سے طعنہ دے گا۔؟

جب تو سودیشی کی تحریک میں تکلیاں لگائے اپنے مِلوں کی کھیتی سیراب کر رہا تھا

اُس وقت یہی مولوی

اپنے بھوکے بچوں سے دامن چھڑا کر سامراجی آقائی کا گریبان پکڑنے جا رہا تھا۔

او انگریز کے اصطبل میں پلے ہوئے خچر
تو مولوی کو کس زبان سے فرقہ پرست کہتا ہے
جب تو اپنے آقاؤں کے اشارے پر
بھائی کو بھائی سے لڑواتا تھا
اس وقت یہی مولوی جامع مسجد کے منبر سے گاندھی جی کی تقریریں کراتا تھا

اے زہر کو اخبار بنا کر بیچنے والے بیوپاریو
تم مولوی کی وطن دوستی کا کیا کھاتا لکھتے ہو؟
شرم سے ڈوب مرو بدبختو!
جب تم دیش بھگتی کے خون سے فاشسٹ ذہنیت کی جڑوں کو کھاد دے رہے تھے
اس وقت یہی مولوی تھا
جو اپنے اثر اور وقار کی جڑوں پر
(دیش بھگتی کے صلے میں) ہم مذہب فاشسٹوں کا کلہاڑا چلتے دیکھ رہا تھا

اے میرے اشتراکی بھائیو
مولوی کو تحقیر سے نہ دیکھو۔

جب ہم پاکستان کے مطالبے میں "حق خود اختیاری" کا جواز دیکھ رہے تھے

تو یہی مولوی تھا

جس نے حق خود اختیاری" اور پاکستان میں فرق تلاش کر لیا تھا

جو پوچھتا تھا

ہم پاکستان تو مان لیں مگر یہ کسے ملے گا عام مسلمانوں کو یا خان بہادروں کو؟

بھائیو، یہ ہندوستان کا مولوی

بخارا اور شور بازار کا مولوی نہیں ہے

ہندستان کا مولوی

قومی آزادی کی جنگ میں اپنا جان و مال دے چکا ہے

اس کے کاندھوں پر جنگِ آزادی کی روایات کا بار ہے۔

اس کے جسم میں جمال الدین افغانی کے لہو کی حرارت ہے

وہ حرارت جس سے چنگاریاں جنم پاتی ہیں

۲۴ر اپریل ۱۹۴۸ء

کسی کی تعریف یا کسی کی برائی میں

کبھی کبھی روپیہ اس زور سے بولتا ہے

کہ صرف اسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اَنمِل۔ بے جوڑ

ترتیب کی کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہر شئے بے ترتیب پڑی ہے
"تیری دنیا ہے دنیا الٰہی، مگر مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے"
جوتوں کو میز کے نیچے ہونا چاہیئے تھا
وہ میرے کانوں میں لٹک رہے ہیں۔
مرارجی ڈیسائی کو کوتوال شہر ہونا چاہیئے تھا
وہ ادیبوں اور اخبار نویسوں کو عقل سکھا رہے ہیں۔
جواہر لال نہرو کو تاریخ و سیاسیات کا پروفیسر ہونا چاہیئے تھا
وہ مداری پروفیسروں کے ہجوم میں گھر گئے ہیں
پرنس یوسف نجم الدین کو ماہر لسانیات ہونا چاہیے تھا۔
وہ پرنس ہونے پر قناعت کر گئے ہیں۔

میری بیوی کو میری پڑوسن ہونا چاہیئے تھا
وہ میری انچارج بن گئی ہیں
سردار جعفری کو کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہونا چاہیئے تھا
وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے ہیں
کیفی اعظمی کو کسی وقف کا متولّی ہونا چاہیئے تھا
ان پر گھن گرج کی تقریریں سوار ہو گئی ہیں۔
حامدالانصاری غازی کو محض ادیب ہونا چاہیئے تھا
وہ وکٹوریہ ڈرائیوروں کے ترجمان بن گئے ہیں۔
پطرس کو مزاح نگار رہنا چاہیئے تھا
وہ "یو، این، او" میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں
سجّاد ظہیر کو "یو۔ این۔ او" میں ہندوستان کا تہذیبی نمائندہ ہونا چاہیئے تھا
وہ حیدرآباد سندھ جیل میں ڈال دیئے گئے ہیں۔
وقار انبالوی کو انبالے کا جاٹ چودھری ہونا چاہیئے تھا
وہ سات اخباروں کے اڈیٹر اور سات بیویوں کے شوہر ہو گئے ہیں
بئے کے گھونسلے کو فن تعمیر کا نمونہ ہونا چاہیئے تھا
وہ صرف گھونسلا ہو کر رہ گیا ہے
سردار عبدالرب نشتر کو قلات کا خان ہونا چاہیئے تھا
وہ محض قلات ہو کر رہ گئے ہیں۔

قلات لفظ کے اردو میں کوئی معنی ہونے چاہیئے تھے۔
اِس لفظ کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔

یکم اکتوبر ۵۱ء

چھاپے کی مشین

اخباروں کی برساتیں دیکھے ہوئے ہوگا وہ شخص جس نے کہا:
"اخبار کی مشین جب تیز تیز چلتی ہے اور بہت چھاپتی ہے تو کرنسی نوٹ چھاپتی ہے اور جب دھیرے دھیرے چلتی ہے اور بہت کم چھاپتی ہے تو ترقی کے وارنٹ چھاپتی ہے۔"
یہ حقیقت بیان کرنے والے کو اللہ کروٹ کروٹ اخبار نصیب کرے۔

پاکستان کے اخبار

کچھ لوگ ہندستان میں رہ کر پاکستان کے اخبار ایسی عقیدت سے پڑھتے ہیں جیسے قرآن کے بعد اُمّت پر یہی صحیفے نازل ہوئے۔
یہ بھلے آدمی گھٹیا سے گھٹیا پاکستانی اخباروں اور رسالوں کو اس طرح سینے سے لگائے پھرتے ہیں جیسے بس اب آخرت درست کرنے کا سامان یہی رہ گیا ہے۔ اور جب خدا محشر میں ان کا نامۂ اعمال سامنے رکھکر پوچھے گا "بتاؤ دُنیا سے

کیا لائے ہو؟" تو وہ جلدی جلدی شیروانی کے بٹن کھولیں گے اور پرانے چیتھڑوں کا بنڈل نکال کر بڑھاتے ہوئے کہیں گے:

"پاک پروردگار! یہ پاکستان کے اُردو اخبار لایا ہوں۔ یہ بھی بلیک مارکیٹ سے خریدے ہیں اور ہندستانی مسلمان کی چھین جھپٹ سے بمشکل بچائے ہیں۔"

۵ر نومبر ۱۹۵۱ء

ٹریجڈی

بھلا سوچو تو میرے بھائی،

اُس مرد کی ٹریجڈی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟

جس کی سنگت میں عورتیں خود کو "محفوظ" سمجھیں۔

(ہر روز و شب و سال)

پایاب

ایسی سنجیدگی سے تو مسخرا پن اچھا

کہ تم جن لڑکیوں سے دوستی کرنا چاہو، ان کے بزرگوں سے دوستی ہو جائے

اور ایسے مسخرے پن سے سنجیدگی اچھی

کہ تم جن خزاں رسیدہ عورتوں سے احترام کے ساتھ ملتے ہو، وہ تمھاری
باتوں میں "سوال" محسوس کرنے لگیں

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

۳ر اکتوبر سنہ ۵۰ء

پتے کی بات

جب کوئی عورت مردوں کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے کہے:
"مرد بڑا شریف اور بہت عالی ظرف ہوتا ہے۔ اس میں عورتوں سے زیادہ برداشت کا مادّہ موجود ہے۔"
تو سمجھ لو کہ اس نے ضرور کسی مرد کو امتحان میں ڈالا ہے اور اس کی قوتِ برداشت کو آزما کر اپنا اطمینان کر لیا ہے۔

اور جب کوئی عورت مردوں کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے کہے:
"مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ جو وہ خود کرتے ہیں، دوسروں کے لئے گوارا نہیں کرتے، اُن کی میٹھی باتوں پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔"
تو سمجھ لو کہ وہ یقیناً کسی مرد کو ابدی نکمّا بنانے میں ناکام رہی اور اُلٹی جلد بازی کا شکار ہو چکی ہے

دُعا

ان کا انتظار کرتے کرتے ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دل اندر سے کہتا ہے،
"اس دنیا کا کوئی خدا ہوتا تو کیا بُرا تھا۔ اسی سے کہتے معبود! اب
تو آنکھیں پتھرا گئیں، انھیں خبر کردے۔ تو ہی قلوب میں بات ڈالنے
والا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔"

دُعا

میرے بھائی!
یہ جو تم دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر خدا سے ایک خاص کام کرا لینا چاہتے ہو۔
تو کیا تم نے سمجھا ہے کہ واقعی خدا تم سے عقل سیکھتا ہے اور تمھارے
مشورہ کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

یکم جنوری ۵۲ء

ذائقے

جو لوگ بہت تیز نمکات کھاتے ہیں ان کی بے نمکی کا بھی جواب نہیں
جو لوگ تیز مرچ پسند کرتے ہیں انقلاب کے بغیر ان کی تسلّی نہیں ہو گی۔
جو لوگ مٹھائی پر گرتے ہیں ان کی جذباتیت ہولناک ہوتی ہے۔
مگر جو لوگ ہر ذائقے سے نبھا لیتے ہیں اور اپنا کوئی ذائقہ نہیں رکھتے۔
وہ فرشتوں کی غفلت سے اِدھر چلے آئے، انھیں جنّت کے حوالے کر دو۔

یکم جنوری ۵۲ء

کُتّا

کُتّے میں بس ایک ہی خوبی ہے، اور وہی عیب بھی سمجھو
مگر عیب سمجھنا کُتّے کا نہیں، سمجھنے والوں کا قصور ہے۔
خوبی یہ کہ کتّا آئی سی ایس افسروں سے بھی زیادہ، بلکہ گورکھا فوجیوں سے
بھی زیادہ آقا کا وفادار ہوتا ہے۔
عیب یہ کہ کُتّا غریبوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ غریب وہ ہے جو

کُتّے کی نظر میں اُس کے آقا کا لباس نہیں پہنتا اور آقا کی زبان میں بات نہیں کرتا۔ سچ پوچھو تو یہ عیب بھی "وفاداری بشرطِ استواری" کا ایک پہلو ہے۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء

گِل گِلا وجُود

جس آدمی کے شعور میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے، ذرا سوچو وہ کیسا گِل گِلا ہوگا
ایسے آدمی سے دوستی کا ہاتھ ملاؤ تو ہوشیار رہنا۔
وہ اُچک کر کہیں آستین میں نہ گھُس جائے
ایسے آدمی کے لئے ہر آستین میں گھُس جانا آسان ہے۔
اور دوسری آستینوں میں رینگ جانا اور بھی آسان۔

اَعْداد و شُمار

وہ شادی کے بعد سے اب تک چار برس کی مختصر مدّت میں چھہتر ہزار چار سو ساٹھ (۷۶۴۶۰) پلیٹیں مانجھ چکی ہے، اور اتنے کپڑے دھو چکی ہے کہ اگر وہ برابر برابر ملا کر رکھ دیئے جائیں تو بارہ میل زمین کا رقبہ ڈھک لیں
چار برس کے اعداد و شمار جمع کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوئی ہے۔

اگر کل کہیں میرے پڑوس کی اینگلو انڈین عورت کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ فوراً اپنے شوہر کے خلاف عدالتی کارروائی کر ڈالے اور اس غریب کو ٹھکرا کر مہالبیشور پر آرام کرنے چلی جائے۔
غنیمت ہے کہ اس نے صحافیوں کی طرح اعداد و شمار کی روشنی میں ہر چیز کو نہیں جانچا ورنہ اس کا اچھا خاصا گھر ہی اُجڑ گیا تھا۔

بے زبانی

یہ کھلا میدان جس کے ایک گھنے درخت کے سایے میں میرا سر زانوئے یار پر رکھا ہے۔ اگر یہ میدان بآوازِ بلند بول سکتا تو کتنے گھر اُجڑ چکے ہوتے اور کتنی اُجڑی ہوئی زندگیاں پھر سے نہال ہو گئی ہوتیں۔
کاش! یہ میدان بآواز بلند بول سکتا۔

ہمسایہ

رحمت ہو علی ابن ابی طالب پر
انھوں نے کہا تھا "سل عَنِ الجَارِ قبلَ الدّار" (گھر لینے سے پہلے ہمسایے کی انکوائری کر لو)

میں نے انکوائری نہیں کی، کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ میرے ہمسائے سچے مسیحی ہیں۔ مسیح نے کہا تھا "اپنے ہمسائے سے محبّت کرو" میرے ہمسائے مجھ سے محبت کرنے لگے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اُن کی محبت بڑھتی چلی گئی۔ میری خوشی اور افتخار میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر اُن کی محبّت کا دائرہ اور اس کی گرفت کچھ اس طرح بڑھی جیسے برطانیہ اور اس کی نوآبادیات پر امریکہ کی محبت اور ریگ جہتی کی خواہش۔

اور ایک دن میں نے محسوس کیا کہ میرا وجود اور میری گھریلو زندگی اُن کی محبت و شفقت کے بندھنوں میں بالکل اسیر ہے۔

مسیح تو بے در و دیوار کے گھر میں رہے اور چلے گئے۔ انھیں ہمسائے کی وارفتہ محبّت کا پھل نہیں چکھنا پڑا، لیکن ان کے بعد کسی یوحنا کو کم از کم اتنا تو بتا دینا چاہیئے تھا کہ

بھائی! ہمسائے سے محبّت کرو، مگر صرف اس وقت جب وہ کم بخت تمھاری محبّت کا طلب گار رہو۔

بل پیش کیجیے

آج میرے یہاں صبح ایک اور بچہ پیدا ہوا

میں نرسنگ ہوم کے باہر مردانے میں بیٹھا تھا۔ جب لیڈی ڈاکٹر

زنانہ وارڈ سے ہانپتی ہوئی آئی اور اس نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا: "لڑکا مبارک" تو میں بوکھلا گیا۔

میں سمجھا جیسے اس نے دو سَو روپئے کا بل میرے مُنہ پر مارا ہے۔

۱۱ اپریل سنہ ۵۲ء

کششِ حُسن

ایک دن پاربتی بن سنور کر شیو کے پاس آئیں۔

پاربتی نے پوچھا:- "شیو! ذرا اِدھر دیکھو، میں کیسی لگتی ہوں؟"

شیو نے میٹھی نظروں سے دیکھا، مگر چپ رہے۔

پاربتی نے پھر پوچھا "شیو — میں تمھیں — سچ بتاؤ کتنی عزیز ہوں میرا حُسن؟ ......؟" شیو نے آہ بھری اور بولے "تمھارے حُسن میں، پاربتی بلا کی کشش ہے۔ تمھارا حسن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک خواب صورت مگر آدھ سُنا گیت۔"

پاربتی نے خوشی کے مارے شیو کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

شیو کے منہ سے کیسے غضب کی بات نکل گئی۔ حُسن کی کشش کا سارا راز کہہ گئے شیو۔

بعض[۱] اَن سُنے گیت ہوتے ہیں۔ بعض آدھ[۲] سُنے اور بعض[۳] بار بار

کے سُنے ہوئے اور گُنے ہوئے۔

تیسری قسم میں "ناسمجھ بیویاں" آتی ہیں، اور دوسری قسم میں "ہوشیار دیویاں" جو عموماً اپنے چاہنے والوں کی بیوی نہیں ہوتیں۔

۳ مارچ ۵۲ء

حیوانِ ناطق

پُرانے زمانے میں منطق والوں نے انسان کی تعریف کی تھی "حیوانِ ناطق" (بولنے والا جانور)

تم جو بہت بولتے ہو تو شاید تم نے انسان کو "حیوانِ ناطق" ہی سمجھا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ بڑا انسان بننے کے لئے زیادہ بولنا ضروری ہے۔ جو بڑا "ناطق" ہوتا ہے اس کے بڑے "حیوان" ہونے میں کیسے شبہ ہوگا؟ لیکن بڑا انسان؟ وہ صرف اس وقت بولتا ہے جب بولنے میں نقصان ہو۔

۴ راکتوبر ۵۰ء

کھٹمل

کھٹمل اور مچھر مہذب آدمی کو ہی کاٹتے ہیں۔

یہ جملہ کامریڈ لینن نے کہا تھا۔ میں نے یہ بات اُن رشتہ داروں کے سامنے دُہرائی جو روزانہ غلاظت کی جھیل کے کنارے میٹھی نیند سویا کرتے تھے۔ وہ اس جملے پر صرف ہنس پڑے۔ تب میں سمجھا کہ جملوں کی خاصیت بھی کھٹمل اور مچھر کی سی ہے۔

۷ر اکتوبر ۱۹۵۰ء

مجرّب نسخہ

آج میں نے ایک مریضِ عشق سے کہا:

ابے مسخرے: گھانس کھا گیا ہے کیا؟ جو لونڈیا فلم کے چکر میں پڑی ہو، اس کا عشق تجھے بھی چکرا دے گا۔ اگر اس نے چار دن تجھ سے والہانہ پیار کیا بھی تو کیا۔ یہ چاہت چوّنی کی مارچ ہے۔ ہفتہ بھر چلے گی اور پھر مسالہ ختم۔ چوّنی کی بیٹری کو گرم رکھنے کے لئے ہر ہفتہ نیا مسالہ چاہیے اور تیرا اثاثہ؟ وہی چار تنکے بھائی۔ آسمان کی چھت کے نیچے اور کھرّے تخت کے اوپر سو۔ صبح اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے اشنان کر۔ سر پر اُسترا پھروا لے اور صبح شام خمیرۂ مروارید عنبری قسم اوّل چاٹا کر اور کانٹ یا برکلے کے فلسفہ کا وِرد کیا کر۔ اللہ چاہے تو پندرہ دن میں شفا ہو جائے گی

یہ بزرگوں کا مجرب نسخہ ہے ایسے امراض کے لیئے۔ مگر
اس بے ایمان نے میری بات نہ مانی۔ آخر تھا تو میرا ہی دل۔

۳ر مارچ سنہ ۵۱ء

تندرستی کا نسخہ

تم نے سرخاب صاحب کو اب سے پانچ برس پہلے نہیں دیکھا
وہ بڑے دُبلے پتلے اور بالکل سوکھے ہوئے تھے۔ اچانک انھیں ایک
پہنچا ہوا سادھو مل گیا، اور اُس نے اُن کے کان میں تندرستی کا نسخہ بتا دیا۔
اب وہ بہت بھاری بھر کم نظر آتے ہیں۔ خوب پھیل کر بیٹھتے ہیں۔
جس کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں وہ اُن کے وزن اور اُن کی جیب کے
وزن سے کراہنے لگتی ہے۔
نسخہ انھوں نے راز میں رکھا ہے اور خوب استعمال کیا ہے۔
کثرتِ استعمال سے اُن کی کھال موٹی ہو گئی۔

۲ر اپریل سنہ ۴۹ء

لاگ اور لگاؤ

سکھ اور شمالی مغربی ہند کے مسلمان اخلاق و عادات کے لحاظ سے بالکل ایک جیسے ہیں۔

ابو الفتح پنجاب کے ایک متوسط خاندان سے ہیں۔ میں اور وہ اس مسئلے پر طبع آزمائی کر رہے تھے! انھوں نے کہا: "سکھ اور مسلمان دونوں شروع سے وحدانیت پرست ہیں۔" میں نے کہا: "ہاں وحدانیت پرست مذاہب بعد کے مذاہب ہیں اور ان میں اس عقیدے کی وجہ سے اکثر باتیں مشترک ہیں"

انھوں نے کہا: "دونوں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کھانے پینے پہننے میں اُڑا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا: "یہ کھانے پینے زمیندار اور فوجی طبقے سے تاریخی تعلق رکھنے کا اثر ہے"

انھوں نے کہا: "سکھ اور مسلمان دونوں یار باش ہوتے ہیں"

میں نے جواب دیا: "جنگی روایات اور فارغ البالی کی زندگی ایک زمانے تک گزارتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یار باشی کی عادت نسلوں میں سرایت کر جاتی ہے۔

انھوں نے کہا: "سکھ اور مسلمان دونوں بہادر ہوتے ہیں اور بہت جلد مشتعل بھی ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا: "اس کی وجہ ان کی سرزمین کی جغرافیائی

حیثیت ہے اور وہ تاریخی حالات جن سے انھیں گزرنا پڑا۔"

ابوالفتح نے کہا: سکھ اور مسلمان دونوں بد ہوتے ہیں بد طینت نہیں ہوتے"

میں نے شرط لگائی: "بشرطیکہ وہ ذہنیت اور پیشے کے مہاجن نہ ہوں"

ابوالفتح نے کہا "سکھ اور مسلمان دونوں بیوقوف ہوتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا: بشرطیکہ بے وقوف کے وہ معنی نہ ہوں جو لغت میں لکھے ہیں۔"

۱۱ر جون سنہ ۵۰ء

میں بھی حاضر تھا وہاں...

میدانِ حشر میں جب حضرت "حق" نے ملّا کو بہشت بھیج دینے کا حکم دیا تو علامہ اقبال وہاں موجود تھے اُن سے "ضبطِ سخن" نہ ہو سکا۔

اقبال مچل گئے اور انھوں نے کہا "واہ اللہ میاں۔ یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ ملا کو جنت بھیجنے کا حکم نہ دیجیے یہ بیچارہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا کیونکہ اس کا پیشہ ہے فرقوں اور مذہبوں کو لڑانا۔ مسجد مندر کے قضیئے اُلجھانا۔ "اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت"

اقبال جب یہ کہہ کر دل کی بھڑاس نکال چکے اور اپنی پنجابی ساخت کی مونچھوں کو کلمے کی انگلی اور انگوٹھے سے "تاؤ" دیتے ہوئے واپس

جانے لگے تو اللہ میاں سوچ میں پڑ گئے تھے اور حضرت ملّا کے چہرے کا رنگ اُڑ چکا تھا۔

حضرت ملّا کو اندیشہ تھا کہ اس قلندر بیرسٹر کی منطق سے اللہ میاں اپنی پہلی رائے نہ بدل ڈالیں اور اس اندیشہ کی وجہ سے ان کے چہرے کا پورا رقبہ ماتھے کے گٹّے کی طرح نیلا پڑ گیا۔ ایسا نظر آنے لگا کہ وہ عمر بھر صرف ماتھے سے نہیں بلکہ پورے چہرے سے سجدہ کرتے رہے ہیں۔

میں بھی حاضر تھا وہاں اور میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس کڑے وقت پر میں نے خاموشی کو بے محل سمجھا اور دو قدم آگے بڑھ کر عرض کیا:۔

"اے معبود! تیرے انصاف کی نہ حد ہے نہ شمار، مجھ ذرّہ بے مقدار کی ناچیز رائے میں تیرا حکم بالکل عدل پر مبنی ہے۔ میں اس کے آگے سر جھکاتا ہوں۔

جنّت کا عام تصوّر تو یہی ہے ناکہ وہاں نہ تو کسی کو کسی طرح کا آزار ہوگا نہ کام کاج ہوگا۔ نہ مشقت کرنی پڑے گی نہ کچھ فرائض اور پابندیاں ہوں گی۔ ادھر کسی شئے کو جی چاہا اُدھر وہ موجود۔ ابھی وہ کھا کے بیٹھے تھے کہ پھر ویسی ہی شئے سامنے حاضر۔

دودھ کی نہریں بہ رہی ہیں، بکروں کی طرح منہ لگایا شپ شپ کر کے پیٹ بھر لیا۔ حوریں بیٹی ہوئی ہیں۔ ایک ایک ملّا کو ایک

ایک جوڑا اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ پھر بھی کمی رہ جائے تو غلمان بکثرت دستیاب۔ ترقّی اور تنزّل کی کوئی فکر نہیں تحقیق اور تدقیق کا کوئی جھنجھٹ نہیں، جو غیب سے آیا اس پر ایمان لے آئے۔ نہ انکار کی طاقت نہ اس کی ضرورت۔

پرانے پرانے ظل اللہ اور صاحبانِ دولت جنھوں نے بھاٹ منگوں کو زکوٰۃ دی ہے اور فالتو لوگوں کو حج کرائے ہیں جنّت میں محلّات قبضائے بیٹھے ہوں گے۔

یہ تمام وہ "اٹ موسٹ فیر[1]" ہے کہ ملا اس کا عادی رہ چکا ہے۔ جنّت کے دولت مند باشیوں سے بھی اس کے پرانے تعلقات چلے آتے ہیں اور تنہا وہی ہے جو ان حالات میں مگن رہ سکتا ہے۔

اے پروردگار تیری مصلحتوں کے قربان۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جنّت محض ملا کے لئے بنی ہے اور ملّا محض جنت کی خاطر وضع کیا گیا ہے اس لئے پہلے حکم پر نظرِ ثانی کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

میری درخواست ہے کہ ملّا اور ملا نما لوگوں کے نامۂ اعمال ان سے لے لئے جائیں۔ جنّت کا فری پاسپورٹ انھیں تھما دیا جائے۔ اور مدّعی اقبال کو اُس کی گستاخی کی پاداش میں ہم لوگوں کے ساتھ جہنّم کے "A"

---

[1] اس لفظ پر فرشتوں نے اعتراض کرنا چاہا تھا لیکن اللہ میاں کا موڈ دیکھ کر چپ ہو گئے۔

بلاک نمبر ون میں بھیج دیا جائے اور ...."

میں اتنا کہنے پایا تھا کہ میدانِ حشر تھرّایا اور خدائے جل جلالہٗ کی آواز گونجی۔ "درخواست قبول ہے"

میں اپنی صف میں واپس چلا آیا۔ ابھی میں اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے نہ پایا تھا کہ کئی ملّا ہانپتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں سمجھا بھلے آدمی میرا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں، لیکن وہ محض درود پڑھتے رہے اور تسبیحیں کھٹکھٹاتے رہے۔

انھوں نے قرأت کے لہجے میں ایک طویل تمہید کے بعد کہا:

"جنّت تو خیر ہمارا حق تھا سو مل گیا۔ لیکن کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ جنّت کے احاطے میں ایک چور دروازہ کھلوا لیا جائے جہاں رضوان کے پہرہ داروں کا پہرہ نہ ہو۔ بات اصل میں یہ ہے مسٹر، جہاں آدمی رہے، چاہے وہ مسجد کا حجرہ ہو یا جنّت کا محل، وہاں ایک چور دروازہ ضرور ہونا چاہیے۔

چور دروازے کی کسی نہ کسی وقت ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔

ہم بھی تو انسان ہیں آخر ——"

۵ مئی ۱۹۵۱ء

کارِ بے کاری

ایک محترم دوست نے انھیں میرے نام سفارشی خط دے کر بھیج دیا تھا
میں نے پوچھا "آپ کتنی تنخواہ تک کی ملازمت چاہتے ہیں؟"
وہ بولے "کم از کم ایسی کہ چائے اور سگریٹ کا خرچ نکل آئے اور زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں۔"

میں نے پوچھا "آپ کی تعلیم!" انھوں نے کہا "اردو آتی ہے۔ افسانے، ناول اور بڑے شاعروں کے دیوان پڑھے ہیں۔ چھٹی کلاس میں تعلیم سے جی اچاٹ ہو گیا تھا اور پھر کسے خبر تھی کہ زمینداره ختم ہو جائے گا اور مجھے عیزوں کی غلامی ...."

وہ کچھ اور تقریر کرتے مگر میں نے دیکھا کہ چہرے بُشرے پہ بزرگوں کی شرافت کی راکھ نظر آتی ہے، اور خود ان کی بے سرو سامانی کا غبار بھی ممکن ہے تقریر طویل کر ڈالیں میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "آپ جسمانی محنت مشقّت کا کوئی کام کرنا پسند کریں گے؟"
وہ بولے "اب تک تو نہیں کیا ممکن ہے آیندہ کرنا پڑے۔" میں نے پوچھا "میونسپلٹی میں چوکی چُنگی کے لئے محرّروں کی ضرورت ہے۔

وہاں تنخواہ کم ہوتی ہے اور ڈیوٹی لمبی" وہ بولے "یہ کام ذرا بے کیف اور بے ڈھب ہے" میں نے کہا "آگے چل کر مشینی کاموں کی اہمیت بڑھنے والی ہے۔ اگر آپ ریڈیو اور بجلی کی دوکان پر مرمت کا کام سیکھ لیں اور وظیفہ بھی ملتا رہے تو کیسا رہے گا؟" انھوں نے کہا "ایسے کام میں آدمی کی شکل صورت اور حلیہ بھوتوں کا سا ہو جاتا ہے" میں نے پوچھا "ایسا کیجیے۔ کتابیں اور اخبارات آپ کو قرض دلوائے دیتا ہوں مناسب کمیشن مل جائے گا اور اگر آپ نے کام چلا لیا تو ....." وہ بولے "صاحب بیوپار کے لیے ایک خاص کینڈے کا آدمی ہونا چاہیے۔ میں تو آپ جانتے ہیں کہ ....."

اب میں نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے کہا "اب آپ کا مسئلہ آسان ہے آپ ایک تخلص رکھیے اور شاعری کیا کیجیے۔ قسم ہے پاک پروردگار کی، اردو داں آدمی کے لیے اردو میں شعر کہنے سے زیادہ آسان اور دلچسپ مشغلہ آج تک دریافت نہیں ہوا۔ شادی اور شاعری سے بڑھ کر ارزاں مشغولیت کوئی نہیں ہو سکتی۔ کم از کم اس ملک میں جہاں پسی ہوئی لڑکیوں اور گھسی ہوئی بحروں کی کوئی کمی نہیں۔

مطمئن رہیے جائے اور سگرٹ کا خرچ بہرحال نکل آئے گا"

۲ راگست ۱۹۵۰ء

بُرقعہ

شہنشاہِ معظم نے پوری سلطنت میں یہ حکم نافذ کر دیا کہ :

کل نمازِ صبح کے بعد سے کوئی بالغ عورت باہر نہیں نکلے گی۔ پہنچوں تک ہاتھ اور ٹھوڑی تک چہرہ پردے سے باہر رہ سکتا ہے لیکن اُن کی آرائش بھی فرمانِ شاہی کی خلاف ورزی سمجھی جائے گی۔

عورتوں کا اپنے جسم کو سجانا اور نمائش کرنا اشتعال اور ہیجان پیدا کرتا ہے۔ ہماری پُر امن سلطنت میں آج کے بعد سے کسی قسم کی اشتعال انگیزی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

عورتوں کی قیام گاہ ان کا گھر ہے اور گھر میں بھی خاص طور سے باورچی خانہ جب تک مجبوری نہ ہو عورتوں کو باورچی خانے میں رہنا چاہیئے اور بہ صورتِ مجبوری وہ باہر نکلیں تو نیم برہنہ لباس یا جسم کی آرائش یا حُسن کی نمائش سے پرہیز کریں۔

اِسکرٹ، فراک، سایئے، ساڑھی، شلوار، تنگ پاجامے، کھڑے غرارے، تیراکی یا شہسواری کے لباس، پینٹ، ہاٹ پینٹ اور اسی قبیل کے تمام منحوس لباس پہن کر جسم چھپائے بغیر نکلنا خلافِ قانون

قرار دیا جاتا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو ۲ سال سے ۱۲ سال تک قید بامشقت یا جرمانہ یا دونوں بھگتنا ہوں گے۔ قید بامشقت سے مطلب یہ کہ انھیں کسی پارک میں بند کر دیا جائے گا اور وہاں وہ دربار کے لئے گلدستے بنایا کریں گی۔ اور جرمانہ سے قانون کی مراد ہے شادی سے ہمیشہ کے لئے محرومی۔

مجھ تک بھی یہ حکم نماز عصر کے قریب پہونچا۔ میں دوڑا ہوا شہنشاہِ معظم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے عرض کیا: "حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو بندگانِ عالی کی خدمت میں ایک درخواست پیش کروں"

حکم ہوا "جلد کہو اور آہستہ کہو"

میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی "دولت واقبال سلامت! عورتوں کے لئے نمائش اور آرائش کی تمام راہیں قانوناً اب بند ہو چکی ہیں لیکن ایک پابندی اور عائد کر دی جائے تاکہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے فوراً گرفت میں آسکیں۔ پابندی یہ ہو کہ کوئی خاتون نئے مصری طرز[1] کا سیاہ برقعہ پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلیں"۔

درخواست قبول ہوئی اور ہر طرف سیاہ برقعے نظر آنے لگے۔

---

[1] اس طرز میں سینے کے نیچے کیسٹاس کی طرح تنگ ہوتا ہے اور چہرہ کا گول دائرہ کھلا ہوا

اسی ہفتے تمام خواتینِ سلطنت نے ایک خفیہ جشن منایا جس میں ایک نے دوسری سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا:

"ارے ہاں! جب گُڑ سے مرتا ہو تو زہر کیوں دیجیے۔ دیکھا، سرکار غچّہ کھا گئی نا!"

رقیب کا دھڑکا

جتنی دیر میں اس گھر میں رہتا ہوں مجھے رقیب کا ڈر لگا رہتا ہے۔

اب آیا اور اب آیا۔

اس سے ایک بار ہمیشہ کے لئے لڑ بیٹھنے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے اور مستقل صلح کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

وہ سامنے آجائے تو کترا جاتا ہوں۔ نزدیک آ بیٹھے تو چکنی چپڑی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ ضرورت ایسی ہی آ پڑے تو خوشامد کرتا ہوں۔ اِدھر اُدھر کی بات کر کے ٹال جاتا ہوں تاکہ اسے میری نیت پر کبھی شبہ نہ ہونے پائے۔

کبھی کوئی کہانی سنا دیتا ہوں کسی اور کی لکھی یا سنائی ہوئی۔

کبھی کوئی نظم یا گیت گا دیتا ہوں کسی اور کا کہا ہوا۔

کبھی مختلف بہانوں سے اس کے شوق کی چیزیں فراہم کر کے لاتا ہوں

یہ بھی اعتماد قائم رکھنے کی ایک صورت ہے ۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں اس کی بعض "بے اعتدالیوں" کو ایسی خاموشی سے پی جاتا ہوں جیسے یہ بھی میری مسرت کا سامان ہیں ۔ عجب اُلجھاؤ ہے۔

ایک وجود کو ہم دونوں چاہتے ہیں ۔ برسوں سے چاہتے ہیں۔ چاہنے کا معاملہ بھی اب کوئی راز نہیں رہا ۔ پھر بھی راز رکھنے کی کوشش میری طرف سے جاری رہتی ہے مگر وہ اس قصہ میں اتنا دبنگ ہے جیسا وہ مرحوم کہہ گئے ہیں کہ

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

میری اور میرے رقیب کی پہلی ٹکر اچانک "اُن" کے گھر میں ہوئی ۔

میں ایک زمانے بعد وہاں پہنچا تھا ۔ سفر کی تکان ۔ راتوں کا جاگنا نیند جو آئی تو ایسی مدہوش کہ دن چڑھے تک بے خبر سوتا رہا ۔ اتنے میں آنکھ جو کھلی تو دیکھتا ہوں کہ وہ "اُن" کے گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ کر شک و شبہہ میں مبتلا ہے ۔ اس نے حیرت سے پوچھا "آپ کون؟" اس واقعے کو اب کوئی تین سال ہوتے ہیں ۔

وہ کچھ عرصے سے یہیں آگئی ہیں میرے نزدیک اور وہ مجھے خوب پہچان گیا ہے ۔ اب اس کا شک مبہم یقین کی صورت اختیار کر گیا ہے

اُسے بھی میرے وجود کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے علم میں کبھی ہم دونوں کو تنہائی کا موقعہ نہیں دیتا۔ اس کی نگرانی برابر پیچھا کرتی رہتی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ سارا قصور میرا ہی ہے۔ جس طرح سرمایہ داری اپنی ضرورت کی خاطر مزدور طبقے کو یکجا کرتی ہے۔ مگر یہی سمٹا ہوا مزدور طبقہ اس سرمایہ داری کے مقابلے پر آجاتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا کہ میں نے خود ہی اپنے رقیب کو جنم دیا اور خود ہی اس کے مقابلے پر پست ہوا جاتا ہوں۔

یہ سب تو ہے مگر کیسی دل چسپ بات ہوئی کہ اس کے باوجود ہم تینوں ابھی تک ایک گھر میں امن کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں میری بیوی اور ہم دونوں کا بچہ۔

۹ر دسمبر ۱۹۵۱ء

قصور

مجھے حیرت ہوگئی جب اس نے میری آنکھوں کے سامنے مجھے اندھا کہا
دراصل غلطی میری ہی تھی۔
میں نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ اندھا ہے اُسے صرف کانا کہہ دیا تھا

تمباکو کے فائدے

سرکاری حکم سے شہر میں شراب بندی کے بعد تمباکو بندی ہو گئی
بسوں، ٹراموں، سینما گھروں اور سرکاری اداروں میں تمباکو نہ پیو۔
اس سے اخلاق خراب ہوتا ہے اور صحت بگڑتی ہے۔
وہ کہتے ہیں تمباکو بڑے نقصان کی چیز ہے
چونکہ وہ کہتے ہیں اس لئے مجھے بھی یہی کہنا چاہیئے
چنانچہ میں نے دلائل سوچے اور تمباکو بندی کی حمایت میں اخبار کے لئے اِڈیٹوریل لکھنا شروع کر دیا۔
آدھی رات گزر چکی تھی اور صرف آدھا اِڈیٹوریل لکھا گیا۔
پلک جھپکنے لگی
آدھی رات گئے جب کام کرتے کرتے پلک جھپکنے لگے تو مزدور اور صحافی دونوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ مزدور کو "برقی دباؤ" سے خطرہ ہوتا ہے اور صحافی کو "ورقی دباؤ" سے۔ وہاں ہاتھ بہکا اور ٹانگ مشین کے اندر۔ یہاں ذرا قلم بہکا اور صاحبِ قلم جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔

اڈی ٹوریل کے لئے ایک دلیل اور سوجھی
تمباکو بند ہونا ہی چاہیئے۔ تمباکو بڑے نقصان کی چیز ہے
اس سے دماغ میں خشکی دوڑتی ہے اور نیند اڑ جاتی ہے
میں نے جلدی سے سگریٹ جلا لیا۔
تمباکو بڑے فائدے کی چیز ہے۔
اس سے نیند اُڑ جاتی ہے
نیند اُڑا لوں تو تمباکو کے نقصانات پر آگے مضمون لکھوں

مئی سنہ ۵۰ء

سن و سال

بائی کُلّہ کے پُل پر کل شام بس کے انتظار میں دیر ہو گئی۔
ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی ٹیکسی جا رہی تھی
میں دوڑا کہ ٹیکسی کو دوسرے اُمیدواروں سے پہلے قبضا لوں۔
شہر میں آج کل چھوٹی ٹیکسیوں کی مانگ زیادہ ہے۔
اور بڑی ٹیکسیوں کی طرف ضرورت مند اُس وقت تک نہیں جاتے
جب تک کوئی مجبوری نہ ہو
چھوٹی ٹیکسی کم سن دوشیزہ ہے۔

"جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن"
ہر ایک امیدوار کی نظر اسی طرف رہتی ہے
اور بڑی ٹیکسی؟ ——— جب تک مجبوری نہ ہو۔

میں ادھر سے چھوٹی ٹیکسی کی طرف لپکا
بس کی دوسری لائن سے کوئی اور دوڑا
میں نے ادھر کا پٹ کھولا کسی اور نے اُدھر کا
میں ٹیکسی میں قدم رکھ چکا تھا کہ نگاہیں چار ہوئیں
"اوہ ——— معاف کیجئے" میں ٹیکسی سے اتر آیا
اور چھوٹی ٹیکسی اسی حسینہ کے سپرد کردی۔
حسینہ کی عمر یہی ہوگی کوئی ۱۷، ۱۸ برس
اور چھوٹی ٹیکسی اس کی ہم جولی معلوم ہوتی تھی
ہلکی پھلکی، کم سن اور طلب خیز۔

۵ر جولائی سنہ ۵۱ء

کہیں دیکھا ہے

آج رات ملا بار ہل کے ایک شاندار بنگلے میں شاندار لوگوں کی ایک شاندار
دعوت تھی۔ پورے صحن چمن میں تیز اور دھیمی خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ
رہی تھیں۔ معزز خواتین کے پھولے ہوئے اور پچکے ہوئے گالوں سے شرارے
اڑ رہے تھے۔

ایسے شرارے جو شب برات کو آتشبازی کی پھل جھڑیوں سے اڑا کرتے ہیں
ان میں تماشا بہت ہوتا ہے حرارت کم
چمک بہت ہوتی ہے روشنی غائب

ہجوم خاص سے ہٹ کر میری نظر ایک حسن بیمار پر ٹھہری
لباس سے سادگی ٹپکتی ہے، آنکھوں سے سوگواری
کھلے ہوئے ماتھے سے ذہانت اور انداز سے متانت
"میں نے انھیں کہیں نہ کہیں دیکھا ہے"
میں نے خان بہادر صاحب سے کہا
وہ نہیں مانے اور بولے:

"انھیں اس پورے مجمع میں تنہا میں جانتا ہوں۔ وہ پچھلے ہفتے پہلی بار ہندستان آئی ہیں۔ قاہرہ سے اور چند روز بعد ہانگ کانگ چلی جائیں گی۔ تمھارا خیال غلط ہے۔ تم نے انھیں کہیں نہیں دیکھا"

"نہیں، بندہ نواز۔ میں نے انھیں کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور ہے"

"بالکل غلط۔ یہ محض واہمہ کی بھول ہے" وہ بولے

نہیں میرے بھائی، آپ نہیں سمجھتے
میں جہاں کہیں حسن، متانت اور ذہانت کا گلدستہ دیکھتا ہوں
دل میں ایک آہٹ سی ہوتی ہے۔ جانی پہچانی آہٹ۔
میں مڑ کر پہچاننے کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔
اور بے اختیار یہ لفظ ادا ہوتے ہیں:
"آداب عرض ہے، کہیے آپ اتنے عرصے کہاں رہیں؟"
پھر مڑ کر دیکھتا ہوں
تو مجھے یہ الفاظ فضا میں تحلیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں
"آہستہ بولیے جناب۔ لوگ بڑے ویسے ہوتے ہیں۔"

میں سوچتا ہوں کہ لاسلکی اور ٹیلی ویژن ایجاد ہو گئے۔
مگر ابھی تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہ ہوا

جو اُن لفظوں کو ریکارڈ کر سکتا جنھیں صرف نگاہوں نے ادا کیا ہو

سائنس کے سورماؤں نے۔
مشینی دل اور مشینی دماغ تو بنا لیا ہے۔
عجب نہیں جو نگاہوں کے الفاظ اسیر کرنے والا آلہ بھی بن جائے۔
لیکن اگر ایسا آلہ مشینی دلوں کا رواج ہو چکنے کے بعد عالم وجود میں
آیا تو اہل ذوق اس سے محروم ہی رہنا پسند کریں گے۔
مشینی دلوں کا رواج ہو جانے کے بعد
میں کسی حسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر یہ نہیں سوچوں گا۔
"میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے"

جنوری سنہ ۵۲ء

فحاشی

رِدشن صدیقی نے کیا اچھی بات کہی:-
وہ بوالہوس کہ جنھیں جرأت گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈھ رہے ہیں علاجِ بوالہوسی
کوئی فحاشی کو ادب کہہ کر پیش کرنے والوں سے کہے۔
ارے تمھیں قے کرنا ہی ہے تو اسٹیج سے ہٹ کر قے کرو بدتمیز د!

شعلہ بیانی

اُف کیا شعلہ بیانی ہے

پنڈت جی کے منہ میں یہ زبان ہے کہ چری بھوسی کاٹنے کی مشین کا پھلکا۔

"سجنو! میں تو کہتا ہوں کہ جیسے گندگی سے طاعون پھیلتا ہے ایسے ہی بھوک اور بیماری سے کمیونزم کا نجار، پَرنتو ہندو جاتی مہا پُرشوں کی جاتی ہے۔ ان رشیوں، منیوں اور بھگوان کے اوتاروں کی جاتی ہے۔ جنھوں نے جنگل کی جڑی بوٹی کھا کر دھرم کا بھگوا جھنڈا لہرایا۔ جنھوں نے آتما کو امر کرنے کے وشئے میں شریر کو مٹایا۔ ہم پیٹ کے بندے نہیں ہیں، ہم آتما کے پجاری ہیں۔ روٹی کی سمسیا کیول ان کی سمسیا ہے جو پیٹ کے پجاری ہیں۔ یہ ناستکوں کو لبھا سکتی ہے بھگوان کے بھگتوں کے تو چرن بھی نہیں چھو سکتی"۔

یہ وہی پنڈت جی ہیں جن کے پیٹ کا ٹرک بھرنے کے لئے بیوپاریوں نے کافی رقم اکٹھی کی۔ منڈی کے ایک ایک مزدور سے زبردستی چندہ لیا۔

اور تب بھاؤ تاؤ کر کے پنڈت جی یہاں بھاشن دینے پر رضامند ہوئے اور آئے

مگر صاحب! کیا شعلہ بیانی ہے!

اپنی تردید خود کرنا کوئی ہنسی کھیل ہے کیا۔

۳ر اپریل ۱۹۴۸ء

طنز و مزاح

یارو!

دوسروں پر ہنستے ہو
کبھی کبھی اپنے اوپر ہنس لیا کرو
دوسروں کے زخم بھی زخم ہیں
تمھارے زخم بھی زخم ہیں
زخموں سے کھیلنا تمھیں آتا ہے تو اپنے زخموں سے بھی کھیلو۔
خدا کی قسم جو اپنے اوپر ہنسنے کا حوصلہ نہیں رکھتا
وہ ہنسنے کی بھرپور لذت سے نا آشنا ہے
ہنسنا اُسے آتا ہے جو دہانِ زخم سے ہنسے

تم دوسروں کے دامن سے فلیتہ باندھ کر پھلجھڑی چھوڑتے ہو
اور تماشا کرتے ہو۔
تب تم کیا طنز کرو گے
تم تو خود طنز کی شکار گاہ ہو۔
"ہم تمھیں چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن"

ایک پہیلی

وہ ایک دوشیزہ تھی

ہم دونوں چلتے چلتے ایک تنہا مقام پر پہنچ گئے

آس پاس کوئی نہ تھا، صرف پرندوں کا مدھ بھرا نغمہ سنائی دیتا تھا

وقت اور مقام کی تنہائی کا اشارہ ہوگا کہ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا

پھر میں نے دوسرا ہاتھ بھی بڑھایا

اپنی باہیں اس کے گلے میں حمائل کردیں۔

اس نے مجھے وارفتہ مگر بھینچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا

اس کی نظریں پوچھ رہی تھیں "بس اتنی سی بات؟"

میں نے اپنے لب اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے قبول کئے۔

پھر ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

درمیان سے لباس بھی نامحرم کی طرح رخصت ہوا۔

ہماری چاہت اب بے نیام تھی، بے نقاب تھی اور بے حجاب

قریب تھا کہ اوّل و آخر کا فصل مٹانے کے لئے میں قدم بڑھاؤں

کہ نہ جانے کیسے مجھے اپنے رقیب کا خیال آگیا۔

جس کے نزدیک محبت کے معنی ہیں "کنواری لڑکیوں کی شکار گاہ"

اور میں نے سوچا

"اگر وہ کمینہ میری جگہ ہوتا تو اس کے سوا اور کیا کرتا"

رقیب کی سطح پر اتر آنے کا خیال ایسا شرم ناک تھا۔

کہ اس نے مجھ پر پانی چھڑک دیا اور آنکھ کھل گئی۔

رقیب کی نیچی سطح پر اُتر آنے کے خیال نے مجھے "مہذب" بنا دیا

(یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد میری دوست نے مجھے تنہائی کا کوئی لمحہ نہیں بخشا

اس نے سوچا ہو گا کہ "بس اتنی سی بات)

قول و عمل

لوگ کتاب کو نہیں اہل کتاب کو دیکھتے ہیں

کوئی فلسفہ اپنے آپ کو نہیں منواتا۔

فلسفہ جس قسم کے پیکر تیار کرتا ہے وہ اُس فلسفے کو منواتے ہیں۔

تم جب اپنے نظریے کی تبلیغ کرنے جاؤ تو آئینہ میں پہلے خود کو دیکھ لیا کرو

اور آئینہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس تمھیں اپنا فلسفہ لے جانا ہے۔

۲۶ جنوری سنہ ۵۰ء

جنسِ ہُنر

جس شہر میں مُرارجی بھائی سے بڑا حاکم نہیں
طاؔہر خاں سے بڑا دیش بھگت نہیں
محبوؔب سے بڑا فلم ڈائرکٹر نہیں
فریناؔک موریس سے بڑا اڈیٹر نہیں
پرتھوی راج سے بڑا خادمِ قوم نہیں
عزؔم بازید پوری سے بڑا مکالمہ نگار نہیں
جی۔ ایس عالم سے بڑا ناول نگار نہیں
گگّو سے بڑی رقاصہ نہیں
حسؔرت جے پوری سے بڑا شاعر نہیں
نظؔر سیہوری سے بڑا قدر دانِ سخن نہیں
مرزا حمید ربیگ سے بڑا حکیم نہیں
زاہدؔ شوکت علی سے بڑا خلیفہ نہیں
ہاتھی کی دم سے بڑی کوئی دُم نہیں
اُس شہر میں مجھ سے بڑا احمق کون ہوگا کہ
”میں کم بخت جنسِ ہنر بیچتا ہوں“

اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

آدمی وہ بڑے بااثر اور باحیثیت ہیں لیکن ان کی مجبوری دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا۔

ان کی خوشنودی حاصل کر کے اسٹیٹ کانگریس نے اسمبلی کی کئی سیٹیں جیتی ہیں۔ اور امیدوار کھڑے کرنے سے پہلے ان کی خوشنودی حاصل کر لی گئی تھی۔

وہ دو لفظ کہہ دیں تو ہزاروں آدمیوں کے لئے پالیسی بن جاتی ہے۔ وہ مسکرا دیں تو اس کی تفسیریں لکھی جاتی ہیں۔

وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جائیں تو اس کا چرچا رہتا ہے۔

ان کی "بزمِ ناز" میں اپنے بھی ہوتے ہیں اور پرائے بھی

اور انھیں ایک ایک قدم ایسے سنبھال کر چلنا پڑتا ہے کہ ذرا بہکے اور زمین کی گردش میں فرق آیا۔

کل کہنے لگے ذرا سوچیے صاحب، عبرت کا مقام ہے کہ مرارجی
دیسائی کو شکست ہو اور ہم ایک قہقہہ بھی نہ لگا سکیں۔

میں نے کہا بندہ پرور! میری طرف سے یہ "پرابلم" اردو کا ایک شا
پہلے ہی سوچ چکا ہے، اس نے کہا تھا ؎

اِدھر سے بھی ہے زیادہ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

ہے واقعی عبرت کا مقام کہ مرارجی بھائی جیت کر آئیں تو ناطقہ بند کر
اور ہار جائیں تو ناطقہ بند۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا

۲ر فروری ۵۲ء

قرآنی آیات

اصغر جامعی آج کہنے لگے:

لیجیے صاحب! آپ تو اردو اخباروں میں اسلامی لہر جوش مار رہی ہ
جس اخبار کو اٹھائیے اس میں خبروں کی جگہ آیتیں حدیثیں بھری پڑی ہ
ایک صاحب نے شروع کیا۔ احکام الٰہی۔ دوسرے نے فوراً دو کالم وق
کر دیئے فرمانِ رسالت پناہی۔ تیسرے بزرگ چونکے تو انھوں نے

چھاپے اسلام کی معجزوں سے پشت پناہی - اب ایک روزنامہ بجا ہے۔ وہ چھاپا کرے گا

تم سب کی گمراہی ۔ کم بختو اور بکواہی تباہی

میں نے کہا

میرے بھائی ۔ روزناموں میں اسلامی لہر دوڑانے سے دو بڑے فائدے ہیں اور دونوں کا تعلّق ہے سکّے سے ۔

فائدہ نمبر ۱ زیادہ خبریں حاصل کرنے میں خبر رساں ایجنسی یا نامہ نگار کو روپیہ دینا پڑتا ہے ۔ یہاں چونکہ اللہ میاں اپنے کلام بلاغت نظام کی رائلٹی نہیں مانگتے اس لئے وہ روپیہ بچتا ہے دوسرے ترجمہ کرانے اور ترتیب دینے میں جو رقم لگتی، وہ بھی بچ رہتی ہے ۔

فائدہ نمبر ۲ اردو اخبار کی آمدنی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ۔ کرائسس بڑھ رہا ہے ۔سیل گر رہا ہے ۔ دن میں تارے نظر آ رہے ہیں ایسے کڑے وقت میں خدا یاد آتا ہے اور قرآنی آیات چھاپنے سے خدا کی یاد بھی ہو جاتی ہے اور ماؤں، بہنوں بیٹیوں کو اخبار پڑھنے کی ترغیب بھی

ارے تم تو صرف اتنا کہتے ہو ۔ اگر کل کہیں ان دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ سؤر کی چربی سپلائی کرنے میں سکّے کی بچت زیادہ ہے تو یہ سب کے سب قرآنی آیات چھاپنے کی دوکان بند کریں گے اور سؤر کی چربی سپلائی کرنا شروع کر دیں گے ۔

۱۴ر جنوری سنہ ۵۱ء

آرٹ پروڈکشن

پروڈیوسر صاحب نے مجھے لکھنے کی بات چیت کرنے بلایا تھا۔
مگر آج بھی بات نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ آجکل اپنی نئی فلم کی تیاری میں اس درجہ منہمک ہیں کہ :

صبح دس بجے سو کر اٹھتے ہیں۔ گیارہ بجے تک بیوی بچوں سے جی بہلاتے ہیں۔ بارہ بجے تک پنگ پانگ کھیلتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب کھیلتے ہیں۔ ایک بجے تک غسل کر لیتے ہیں اور کریم وغیرہ لگانے کے بعد کپڑے بدل لیتے ہیں۔ سینٹ اور شمپو بھی کچھ منٹ ضرور لیتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے وہ کھانے کی میز پر آجاتے ہیں۔ ڈو بجے تک قیلولہ کرنے کے لئے ڈرائنگ روم میں آجاتے ہیں۔ کچھ سوتے، کچھ جاگتے، احباب اور ملاقاتیوں سے باتیں ہوتی ہیں اور تین بجے تک کی اس گفتگو کو فلم آرٹ پروڈکشن کے کاروبار میں بڑی اہمیت ہے۔ چار بجے وہ چائے پیتے ہیں، کبھی کبھی پلاتے بھی ہیں۔ ساڑھے چار بجے شام کو وہ گھر سے برآمد ہوتے ہیں اور فائی نینسر یا کسی کاروباری آدمی کے ہاں روانہ ہوتے ہیں۔ چھ بجے کے قریب پیر شین ڈیری

یا کسی اور تفریحی مقام تک پہنچنا فرض تو نہیں لیکن سنّت ضرور ہے
سات بجے کے بعد انھیں اگلی فلم کے لئے نئے چہروں کی تلاش ہوتی ہے
آٹھ بجے رات کی تاریکی اور گہری پیالے کی روشنی اور تیز ہو جاتی ہے
نو بجے سے وہ جام و ساقی کے بہانے فنّی نکتوں کو سلجھانے میں
لگ جاتے ہیں۔ دس بجے چھتے نکل آتے ہیں اور وہ پتّوں پر سیٹے
مارتے ہیں۔

یہ دماغ سوزی اس وقت تک جاری رہتی ہے۔ جب تک کیلنڈر
کی تاریخ نہ بدل جائے۔ آنکھ کھلی اور پھر دوسرا دِن۔
۲۴ گھنٹے میں بھلے آدمی کو لمحے بھر کی فرصت نہیں ملتی۔
ان کی جگہ کوئی دوسرا ہو تو یا پاگل ہو جائے یا لیڈر
آرٹ پروڈیوس کرنا بڑے دِل گردے کا کام ہے۔

ان کے دِل گُردے اسی روزمرّہ کی مشقت میں بالکل کمزور ہو گئے ہیں
میں ان سے کل عرض کروں گا کہ بندہ پرور ایسے جان لیوا کام کا بوجھ
کاندھے پر اٹھانا کچھ آپ ہی لوگوں کے بس کی بات ہے۔

اگر لیل و نہار یہی رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قوم کو پروڈیوسر صاحب
کی ذاتِ بابرکات سے محروم ہونا اور رونا پڑے گا۔

۳ر ستمبر سنہ ۵۱ء

چلتے رہو بھائیو!

فرنیٹر میل فرّاٹے بھرتا ہوا چلا جا رہا ہے
میں اس کی ایک کھڑکی میں بازو پر سر رکھے باہر دیکھ رہا ہوں۔
دُور تک درختوں کے پرے لگے ہوئے ہیں۔
جو ٹرین کے ساتھ دوڑتے نظر آتے ہیں۔
نظر کیسا مزے کا فریب دے رہی ہے۔

میں سوچتا ہوں
یہ بے چارے درخت، جو ایک جگہ ختم کر رہ گئے ہیں۔
جو آگے بڑھنے سے مجبور ہیں
ٹرین کی رفتار انھیں پیچھے کی طرف ڈھکیل رہی ہے۔
ٹرین ان کی خاطر تھمنے کو تیّار نہیں
اور یہ ٹرین کے ساتھ آگے دوڑنے کو تیار نہیں۔
مگر یہ جو دوڑتے نظر آتے ہیں یہ آگے کی طرف نہیں پیچھے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

مجھے کچھ خیال آ رہا ہے۔

(نظمو نہیں چلتے چلتے سنو)

میں سوچتا ہوں کوئی شے اپنی جگہ قائم نہیں
زمانے کا فرنٹیر میل فراٹے بھرتا چلا جا رہا ہے
جو شے آگے کی طرف فراٹے نہیں بھرتی
وہ خود بخود پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔

مجھے وہ لوگ یاد آتے ہیں
جو ہم سے بہت آگے دوڑ رہے تھے
پھر وہ چلنے لگے
پھر وہ تھم گئے
ہم پیچھے سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان سے آگے بڑھ گئے۔
جتنا وقت گزرتا گیا، ہم نے دیکھا کہ وہ ہمارے غبار میں گم ہو گئے ہیں
وہ تھم نہ سکے۔
وہ خود بخود پیچھے کی طرف دوڑ گئے
کوئی شے اپنی جگہ قائم نہیں رہتی
جو شخص بالارادہ آگے نہیں دوڑتا
وہ بلا ارادہ پیچھے کی طرف دوڑتا ہے
زندگی کا مقدر یہی ہے۔

میرے بھائیو !

اگر ہمارا "آج" بھی وہی ہے جو "کل" تھا

اگر ۲۴ گھنٹے بعد بھی ہمارا علم اور عمل وہیں ہے

تو غضب ہو گیا۔ ڈوڑو

ہمارا "آج" خود بخود گزرے ہوئے "کل" میں بدل گیا ہے۔

زمانہ ۲۴ گھنٹے آگے بڑھ گیا۔

اور ہم نے سمجھا کہ ہم دن بھر کے لئے تھم گئے ہیں۔

حالاں کہ کوئی شے اپنی جگہ قائم نہیں

ہماری مثال ان درختوں کی سی ہے

جو دوڑتے نظر آتے ہیں، مگر آگے نہیں پیچھے کی طرف دوڑتے ہیں۔

ذرا سوچو، ہم ایک دن میں کتنا پیچھے دوڑ گئے

اب یہ فاصلہ کیسے طے ہو گا میرے عزیزو ؟

۱۱ر جنوری ۵۱ء

پشیمانی

مجھے عمرِ گزشتہ میں کبھی پشیمان نہیں ہونا پڑا،

مگر ایک بار جب ایک شخص میری لفاظی سے رعب کھا کر بولا:

"آدمی بہت قابل ہیں آپ"

۲ر مارچ ۴۹ء

اشاعتِ اسلام

"صاحب، ہم یہ تاریخی کتاب چھاپنے سے مجبور ہیں۔ اب تو ہم اگلے دس سال کا پروگرام بنا چکے"!

پبلشر نے مصنّف سے کہا

مصنّف نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ پوچھا "کیا میں کسی قدر تفصیل جان سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔ ضرور" یہ کہتے ہوئے پبلشر نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ چار کتابیں سامنے قالین پر رکھ دیں۔ ان میں قرآن پاک تھا۔ قصص الانبیاء، احادیث نبوی اور خدا کی باتیں خدا ہی جانے، جیسی مقدس کتابیں شامل تھیں۔ اور چاروں جلدیں بہت خوشنما۔ مصنّف نے کتابوں کو احترام اور عقیدت کا جذبہ طاری کر کے چھوا۔ اور نئے پہلو سے بات کا سرا پکڑا "آپ نے تو بندہ پرور کمال کر دیا لکھائی چھپائی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ واہ وا۔ یہاں سے الجیریا تک اس کا جواب نہیں ہے۔ (وہ الجیریا کی جگہ الجزائر کا صحیح لفظ بولتے بولتے رکا۔ کیونکہ اسے خیال آیا کہ پبلشر کے لئے الجزائر کا

لفظ ممکن ہے اجنبی ہو اور بات کا اثر اُلٹا پڑے)

"صاحب! طباعت اور گیٹ اَپ کا سلیقہ تو کوئی آپ سے سیکھے۔ کون بدبخت مصنّف ہے جو آپ کی نگرانی میں اپنی کتاب شایع ہونے کی تمنّا نہ کرے گا۔ اور پھر آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک طرف آپ دینِ اسلام کی خدمت .... وہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر بچہ دینِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ ...... خیر تو آپ دینِ اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔ بڑے ثواب کا کام ہے۔ جہاد سے زیادہ ثواب ملتا ہے ان کاموں میں۔ اور پھر اسی کے ساتھ تجارت بھی پھلتی پھولتی ہے اور سچ پوچھئے تو تجارت بھی ثواب کا کام ہے، اور یہ کہ ......"

پبلشر نے انکساری کے ساتھ تبسم بکھیرا اور اپنی ترکی ٹوپی کے پھندنے کو لہراتے ہوئے کہا "آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ ویسے ہم تو اپنی طرف سے دین کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔"

(ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ راستہ بنتا نظر آتا ہے" مصنّف نے اپنے جی میں کہا) "مگر۔ دیکھئے آپ تو جانتے ہیں کہ تجارتی نقطۂ نظر سے کتابوں کا میل ہونا چاہیئے۔ آپ کچھ ادب، کچھ فلسفہ، کچھ میرا مطلب ہے کچھ تاریخ کی کتابیں بھی ......"

"ہاں۔ وہ دیکھئے، میں عرض کرنا بھولا" پبلشر نے شیروانی کے

بٹن گنتے ہوئے جلدی سے بات کاٹی۔ "ہم میل رکھنے کے لئے ادب تو چھاپ رہے ہیں۔ دس سال میں ۲۵ کتابیں حضرت فلاں فلانوی کی ہمارے کتاب گھر سے شایع ہو چکی ہیں۔ آج کل اُن کی مانگ بھی بہت ہے۔ کیا غضب کے لکھاڑ ہیں حضرت فلاں صاحب۔ ان کی جدید تصانیف "شبِ وصال" کی دراز دستیاں" اور رازہائے سربستہ" عرف "انجامِ نہانی" پچھلے سال پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں انھوں نے بک ڈپو سے چھپی تھیں۔ ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں اور پڑھنے والوں کی اب تک رال ٹپک رہی ہے۔

اب اِس مہینے ہم ان کی وہ کتاب چھاپ رہے ہیں۔ کیا نام ہے مشہور مصرعہ وہ۔ کہ

"دِل سرد رہا، بغل رہی گرم"

کے نام سے چھپ رہی ہے اور پہلے سے ہی اُس کے آرڈر آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ادب ہو تو ایسا ہو کہ بس چٹکیوں میں کتاب نکل جائے۔

تاریخی کتاب کے مصنف نے یہ تابڑ توڑ جملے سُنے۔ اس کا دل سرد اور چہرہ زرد ہو گیا۔

۲ دسمبر ۱۹۴۹ء

غیب کی زبان

ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

صبح کا وقت ہے۔ موجوں سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ ہمارا اسٹیمر ساحل سے دُور سمندر میں چلا جا رہا ہے۔ اتوار کا دن ہے۔ لوگ تفریح کے موڈ میں ہیں۔ سامنے دو چار میل پر جزیرہ نظر آ رہا ہے۔ جہاں سارے مسافروں کو اُترنا ہے۔

زیادہ تر مسافر اسٹیمر کے اُس کنارے پر اکٹھے ہیں، پارسیاں لڑکیاں اپنے بھائیوں اور عاشقوں سے چہلیں کر رہی ہیں، کچھ لوگ ان کی خوش وقتی کو دیکھ رہے ہیں۔ کچھ ہیں جو دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں۔ میں اسٹیمر کے دوسرے گوشے میں چلا آیا۔ جہاں انجن سے کئی بڑے بڑے رستے بندھے ہوئے ہیں اور موجوں سے کھیلتے چلے جا رہے ہیں

غلام احمد خاں آرزو کو فارسی کے بہت سے شعر یاد ہیں۔ انھوں نے بُش شرٹ کی جیبوں میں بے فکری سے ہاتھوں کے کنگھیر لگا دیئے اور کئی شعر نکالے۔

مجھے بے سبب وہ حافظ کی غزل یاد آئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

میں نے ساری وضعداریاں پُرانے کوٹ کے ساتھ اتار کر ایک طرف ڈال دیں اور خوب چٹکیاں بجا بجا کر اور لہک لہک کر ایک ایک شعر اس غزل کا پڑھا۔ اُس پاس کے کئی باذوق آدمی حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ سب جھومنے لگے۔

اتنے میں کسی نے کہا "چلو بس تیار ہو جاؤ۔ جہاز آگے نہیں جائے گا کشتیوں میں کنارے چلنا ہے۔"

میں نے کہا "یارو جانا نہیں۔ دو شعر اور ہیں ابھی"

دوسرا شعر میں اٹھا ہی رہا تھا کہ کشتی آئی اور اسٹیمر کے گلے میں باہیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کئی خوش باش نوجوانوں نے اپنے اپنے دوستوں کو بازو کا سہارا دے کر اسٹیمر سے کشتی میں اُتار دیا اور خود لنگوٹ کس کر سمندر میں کود پڑے کہ کشتی سے پہلے تیر کر کنارے پر پہنچ جائیں۔ اور وہاں اپنے رفیقوں کا انتظار کریں۔

"ہاں وہ شعر ——

کشتی شکستگانیم، اے بادِ شُرطہ برخیز
اے بادِ شرطہ برخیز۔ اے بادِ شرطہ برخیز

کئی آوازوں نے میرا ساتھ دیا۔

ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی شاید اسی شعر کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔ وہ پیراکی کے لباس میں مستعد کھڑا تھا۔ اس نے اُچک اُچک کر اس مصرع کا مزا لیا

اور یک بارگی سمندر میں کود گیا۔ کنارے پر ہم سے پہلے پہنچنے کے لئے اور لوگ بھی پیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ کسی کو ادھر توجہ نہ ہوئی۔

ہم نے آخری شعر بلند کیا۔

کشتی شکستگانیم اے بادِ شُرطہ برخیز
شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

اے بادِ شُرطہ برخیز
کشتی شکستگانیم

"دوڑو۔ دوڑو۔ ہائے وہ ڈوبا" کی آوازیں پشت سے ایک ساتھ بلند ہوئیں "لطیف۔ ارے لطیف کو بچاؤ"

اسٹیمر آگے جا نہیں سکتا تھا۔ کشتی میں پہلے سے ہی نازک اندامانِ کالج لدے ہوئے تھے۔ وہ بھی ڈول کر رہ گئی۔ کنارے سے لوگ چلائے جہاز پر سے "یارانِ آشنا" نے صدائیں بلند کیں۔ مگر کوئی اُسے نہ پا سکا۔ وہ گرداب میں پھنس کر گُم ہو گیا۔ کسی نے مجھ سے کہا:

"بعض بعض زبان بھی بڑی زہریلی ہوتی ہے اور بُری فال مُنہ سے نکالو"

ہیں دبی آواز سے سارے دن وہی شعر گنگناتا رہا
واپسی کے وقت شام کو ہم سب نے اس کی لاش دیکھی، جو کنارے آلگی تھی۔ مرنے والے کے کئی دوست اُسے حیرت وغم کے ساتھ دیکھتے رہ گئے

شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

مئی سنہ ۵۲ء

ظہور سیٹھ

مہینے کے آخر میں جب میرے روحانی باپ بدر الاسلام مرحوم کے پاس تنخواہ کے پیسے ختم ہو جایا کرتے تھے تو وہ اپنی خوب صورت عینک اُتار کر سلک کے شفاف رومال سے اُسے صاف کرنے لگتے تھے۔ کرسی پر پاؤں سکیڑ کر درویشانہ انداز سے بیٹھ جاتے تھے اور وہ اپنے ہاتھ سے چوڑے ماتھے کو سہلاتے ہوئے مجھ سے کہتے:

"بھئی آج تم ظہور سیٹھ کے پاس ہو آتے تو اچھا تھا"

ظہور سیٹھ میرٹھ میں .... بازار کے پاس رہا کرتے تھے۔ ان کے تین چار مکانات تھے، پانچ سات بچے تھے اور کئی رشتہ دار جو شام کو ان مکانوں کی چھت پر کنکوّے اور آنکھیں لڑایا کرتے تھے۔

ظہور سیٹھ اور پنڈت بدری پرشاد کے مکان پاس پاس تھے۔ اور دونوں میں عمر کے فرق کے باوجود یارانہ تھا۔ دونوں مشترک طور پر بدرالاسلام مرحوم کے معتقد بھی تھے اور دوست بھی۔

جب ظہور سیٹھ کو اپنے مکانوں سے کرایہ وصول ہونے میں دیر ہوتی اور وہ اُدھار دینے میں ذرا ہچکچاتے تو میں خود سے پنڈت جی کا دروازہ کھٹکھٹا دیا کرتا تھا۔

پنڈت بدری پرشاد بڑے پیارے آدمی تھے انھوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان کے کئی لڑکے تھے، سب پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار ان کی پُرانے وقتوں کی الماری میں شیخ سعدی کی گلستاں، انوارِ سہیلی رامائن، مثنوی مولانا رومؔ، لغتِ کشوری، سنسکرت کی دوچار کتابیں —— اور ان کے علاوہ ایک صندوقچی رکھی رہتی تھی۔ اس صندوقچی میں پانچ پانچ۔ دسؔ دسؔ کے نوٹ، روپئے اور اکنّیاں دُوَنّیاں، بھری رہتی تھیں۔

بوڑھے پنڈت جی پہلے میری اور بدرالاسلام مرحوم کی خیریت پوچھتے پھر شیخ سعدی کا کوئی جملہ، یا گیتا یا رامائن کا کوئی شعر سناتے۔ رگ وید کا کوئی منتر پڑھتے اور جب انھیں یقین ہو جاتا کہ میرے چہرے پر سعادت مندی کے آثار ابھر آئے ہیں تو وہ صندوقچی کھولتے اکنّیوں، دُوَنّیوں کی ایک ایک پڑیا نکال لیتے اور ان سب کو ایک

بڑی سی پڑیا میں لپیٹ کر مجھے دے دیتے۔

جب میں ان کی ڈیوڑھی پر پہنچتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتے۔ بار بار کہتے جاتے دیکھو! ہوشیاری سے جانا۔ راستے میں کھیلنا مت۔ روپئے مت کھو دینا۔ میں اُن کے دروازے سے باہر نکلنے لگتا تو وہ دروازہ بند کرنے سے پہلے پھر ایک بار مجھے بلاتے ـــــ دیکھو میاں تم برُا مت ماننا۔ تم میرے بیٹے سمان ہو۔ بھائی صاحب کو سلام کہنا۔ بھابھی صاحبہ کی خیریت پوچھنا میری طرف سے۔ اور ہاں سنو، تیز جاؤ۔ جانے دو بھئیں دیر ہو گی۔

میں نے ایک بار اپنے مرحوم استاد سے پوچھا "آپ پنڈت جی کو روپیہ واپس کرنے میں اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں؟ پنڈت جی نے تو خود کبھی تقاضا بھی نہیں کیا۔ ان کی آمدنی کے تو راستے ہیں اور خرچ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اُن کے پاس روپئے کی کیا کمی۔ لیکن یہ ظہور سیٹھ مجھے صرف نام کے سیٹھ معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ظہور سیٹھ کو روپیہ واپس ملنے کی جلدی رہتی ہوگی۔ انھی کو آپ چار چار مہینے روپیہ واپس نہیں کرتے یہ کیا بات ہے؟"

مجھے یاد ہے کہ بدرالاسلام مرحوم نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور صرف نگاہیں نیچی کر لیں۔

اس واقعے کے کوئی نو برس بعد جب مولوی بدر الاسلام کا انتقال ہو چکا تھا، ایک روز ناگہانی میں میرٹھ پہنچا اور برسوں پہلے کی ملاقاتیں تازہ کرتا پھرا سارے دن۔ ایک جگہ راستے میں پنڈت بدری پرشاد کا مکان بھی پڑتا تھا۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی اب اس مکان میں نہیں رہتے۔ ان کے بڑے بیٹے نے شہر سے باہر کچہری روڈ پر ایک نئی کوٹھی بنوالی ہے۔ وہ لوگ اب وہیں چلے گئے ہیں۔ پنڈت جی کے درشنوں کو بہت جی چاہا ہیں ان کا پتہ معلوم کر کے کچہری روڈ کی طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں اب پنڈت جی وہی ہیں یا بدل گئے۔

میں پہنچا تو کوٹھی کے دروازے پر پہرہ دار نے روکا، اور مشکل سے اندر جانے دیا۔ پنڈت جی برآمدے میں دھوتی سکھا رہے تھے دیر تک میرا اتہ پتہ پوچھتے رہے۔ دیر کے بعد پہچانے۔ پہچاننے کے بعد رو پڑے۔ آنسو پونچھتے جاتے تھے اور بدر الاسلام مرحوم کا ذکر کرتے جاتے تھے:

"ہمارے باپ دادا ان کے ہاں حساب اور کھاتا لکھنے پر منشی تھے پھر مختار عام ہو گئے۔ تم نے وہ گھر دیکھا نہیں۔ مفتی صاحب کا گھر بڑا شاندار تھا۔ اس میں ایک تہ خانہ بھی تھا اور وہاں ایک بڑی سی تجوری رکھی تھی۔ جب میرے پتا جی لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے

اور گھر میں بیٹھ رہے۔ تب ہم بہن بھائی چھوٹے چھوٹے تھے۔ میری شادی ہونے والی تھی۔ مفتی صاحب کو خبر ملی تو انھوں نے پتاجی کو بلایا اور بولے "یہ بیٹا میرا ہے۔ میں اس کے اور اس کی چھوٹی بہن کے بیاہ کا پورا خرچ خود کروں گا"۔ انھوں نے اسی تجوری میں سے نکال کر اشرفیوں کی ایک پوٹلی میرے پتاجی کو دی تھی ضروری سامان خریدنے کے لئے۔ ہائے اب وہ زمانے اور وہ لوگ کہاں رہ گئے ہیں"۔

تیسرے پہر کا سارا وقت پنڈت جی کے ہاں گزرا۔ وہ اب بھی ویسے ہی لہک لہک کر فارسی کے شعر سناتے تھے اور مجھے نصیحتیں کرتے جاتے تھے۔

رات کی گاڑی سے مجھے لاہور جانا تھا اور ٹکٹ میں دن میں منگوا چکا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اسی روز تانگے والوں نے ہڑتال کر دی۔ اب اسٹیشن پہنچنے کے لئے کسی سواری کا پتہ نہیں اور ریلوے اسٹیشن شہر سے کوئی دو میل فاصلے پر۔ میں ناچار سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر پیدل چل کھڑا ہوا۔

دن چھپ چکا تھا۔ چراغ جلنے لگے تھے۔ سڑک پر اکا دکا دیہاتی مسافر گٹھریاں لادے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ میں راستے میں ایک ایک دوکان اور ایک ایک عمارت کو پہچانتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ سائیکل والے ملاجی کی دوکان ہے۔ ایک آنے گھنٹے پر سائیکل دیا کرتے تھے

اور اگر دو چار منٹ زیادہ ہو گئے تو دوسرے گھنٹے کا کرایہ بھی وصول کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے امرودوں کا باغیچہ جہاں برسات میں امرود چراتے وقت ہمیں کئی بار نالے میں گرنا پڑا۔ چوری کے امرودوں میں جو مزہ تھا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ باغیچے کے پیچھے کچھ جھونپڑوں میں موچی رہتے ہوں گے اب بھی۔ ارے ہاں۔ وہ بھولو موچی۔ دو دو روپئے میں اس نے کیسے چڑمڑ کرتے ہوئے شاندار بوٹ بنا بنا کر پہنائے ہیں۔ بہت جی چاہا کہ بھولو کے ہاں جاؤں، دروازہ کھٹکھٹاؤں اور جب وہ کڑوے تیل کا دیا لئے ہوئے نکلے تو پوچھوں "بھولو! مجھے پہچانتے ہو تم؟" وہ اب نہیں پہچانے گا اور پھر میں اس کی بیوی کا نام لے کر پکاروں گا۔ پھر بچے کا۔ پھر گھر کے اندر کا سارا نقشہ بیان کروں گا۔ وہ پلکیں اوپر کو اٹھائے گا۔ مسکرائے گا، اور میں کہوں گا "بھولو! وشواس کرنا میں نے اس دس برس میں ایک سے ایک بڑھیا دوکان کے فیشن ایبل جوتے پہنے، مگر جو خوشی کا راگ تیرے بنائے ہوئے بوٹوں سے نکلتا تھا۔ وہ کہیں نہیں ملا رات کو خواب میں مجھے تیرا گھر نظر آیا کرتا تھا کہ جس کے ایک کونے میں دو روپئے کے نئے چمکدار بوٹوں کا ایک ایک جوڑا فریم میں لگا ہوا رکھا ہے اور عید کی صبح کا انتظار کر رہا ہے۔"

پھر میں سڑک پر آگے بڑھا۔ ایک شوگر مل کے نئے کوارٹر بن رہے تھے۔

افوہ! یہ نئے کوارٹر۔ پہلے تو یہاں ترکاریوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اور کھیتوں کے اُدھر فٹ بال گراونڈ تھا۔ مجھے وہ رمضان کا مہینہ یاد آگیا جب میں روزے رکھتا تھا اور فٹ بال کے آخری گیم میں افطار کا وقت آجاتا تھا تو میں اور میرے دو ایک دوست دبے پاؤں ان کھیتوں میں گھس جاتے تھے۔ مالیوں کی نظر بچا کر گاجریں، شلجم اور مولیاں چرا لیا کرتے تھے۔ ابھی سے افطار ہوتا تھا اور روزہ داری کی لذت بڑھ جایا کرتی تھی۔ مفت کی تازہ تازہ گاجریں اور دن بھر کی بھوک پیاس۔ اگر ویسی ہی لذیذ گاجریں چرا کر کھانے کو ملیں تو میں پھر ایک بار روزہ رکھنے کو تیار ہو جاؤں۔ اس زمین میں کیسی کیسی مزے کی یادیں سو رہی ہیں۔ میرے دل میں میٹھا سا درد اٹھا۔

قریب تھا کہ میں دس قدم بڑھ کر پل کے نالے پر دم لینے کے لئے بیٹھ جاؤں اور آنکھیں بند کر کے اُن یادوں کو پھر جگاؤں جن کی خوشبو میری سانسوں میں گھلی جا رہی ہے۔ کہ اتنے میں سڑک کے اُدھر سے کسی نے آواز دی۔

"بابو جی —— پلیز —— وَن منٹ"

میں چونکا کہ شاید کوئی مجھی کو پکار رہا ہے۔ مگر یہ آواز کچھ سُنی ہوئی سی تھی میں تھم گیا۔ اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس شخص نے اپنی

داستان کہنی شروع کردی "بابوجی، میں کلکتہ کا ایک بیوپاری ہوں۔ میرا قینچیوں کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ میں پہلی بار بزنس کے لئے آیا تھا۔ راستے میں آنکھ لگ گئی۔ سارا سامان بھی لٹ گیا اور جیب بھی کٹ گئی۔ میں یہاں کسی کو جانتا نہیں۔ پورا دن گزر گیا ہے کہ ایک کھیل اُڑ کر منہ میں نہیں گئی میرے حال پر کرم کیجئے۔ اتنی مدد کر دیجئے کہ گھر کو تار دے کر روپیہ منگالوں اور دو لقمے پیٹ میں ڈال لوں۔ میں نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا ہے"

میں نے شام کے اندھیرے میں غور سے کلکتہ کے بیوپاری کو دیکھا۔ وہ بولتا چلا جا رہا تھا "میری عزت رکھ لیجئے اور اپنا پتہ لکھوا دیجئے۔ بھگوان کی سوگند میں آپ کو کلکتہ سے روپیہ آتے ہی منی آرڈر کر دوں گا بابوجی۔"

میرے ماتھے پر بجلی سی چمکی۔ میں نے جلدی سے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے جو کچھ ہاتھ میں آیا اس کی مٹھی پر رکھ دیا۔ روپیہ لینے کے بعد اس نے پتہ لکھنے پر اصرار نہیں کیا۔

وہ شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ میں کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے ظہور سیٹھ کو پہچان لیا ہے تو کہیں میری آواز سے وہ مجھے نہ پہچان لے اور روپیہ پٹک کر بھاگ جائے۔

حالاں کہ یہ ادنا سی رقم ان روپیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو وہ مجھے اور میرے مرحوم استاد کو دے کر بھول چکا تھا۔

۳ رجون ۴۸ء

معاشی بُحران

تصدیق سہاروی آج اپنے مارہرہ شریف کا ذکر کر رہے تھے۔
کہنے لگے "بوڑھی گنگا بڑا جلالی دریا ہے۔ کبھی کبھی جب اس میں برسات کا پانی بڑھ جاتا ہے تو دریا اندر ہی اندر زمین کاٹ ڈالتا ہے، اور سینکڑوں دیہات غرقاب ہو جاتے ہیں اور کبھی آہستہ آہستہ اتنا سوکھ جاتا ہے کہ آس پاس کی فصلیں بھی جلنے لگتی ہیں"
میں سُنتا رہا اور میں نے سوچا۔
یہ حضرت بوڑھی گنگا کا ذکر کر رہے ہیں یا جوانی کا؟ یہ جوانی کا ذکر ہے کہ زر کا؟
جوانی کا تذکرہ ہمارے بزرگوں نے کچھ اسی قسم کا کیا ہے لیکن زر کی اس بے اعتدالی اور افراط تفریط کا تجربہ ہم لوگ کر رہے ہیں۔
جلالی دریا ــــ چاہے وہ بوڑھی گنگا ہو، جوانی ہو، یا زر۔
ان سب کا یہی حال ہے اور ان کی بے اعتدالی کا علاج وہی ہے جو فطرت کی تمام وحشی قوّتوں کے لئے رکھا گیا ہے کہ انھیں رام کرو، کنٹرول میں رکھو اور بند لگاؤ۔

جتنے پانی کی ضرورت ہو اتنا لے لو اور کھیت سینچ لو۔ باقی پانی روکے رکھو۔ اگلی ضرورت کے لئے۔

جن جوانوں نے کبھی خلوت کی تاریکیوں کو اپنے حسن کے چراغ سے
رات رات بھر روشن رکھا ہے۔ کبھی ان کا بڑھاپا دیکھو تو عبرت ہو کہ جلالی
دریا پر بند نہ لگانے کا انجام کیسا ہوتا ہے۔

زر کو لوگوں نے اپنی محنت سے پیدا کیا۔ پھر وہ سرمائے میں تبدیل ہوا
پھر کچھ لوگوں نے تجارت کی آزادی کہہ کر اسے بے لگام چھوڑ دیا چنانچہ
کئی چھوٹے چھوٹے دھارے ایک بڑا دھارا بنے اور دوسرے دھاروں کو
نگلتے چلے گئے۔ پھر وہ ایک طوفانی دریا بن گئے۔ جنھوں نے چھوٹے
چھوٹے کھیتوں کو غرقاب کر دیا۔ ان کی وحشی قوت ایسی بے محابا ہو گئی کہ
خود اس کے کھلے بندوں چھوڑنے والے پناہ مانگ گئے۔ دھارا
ایسا بڑھا کہ اندر ہی اندر زمین کاٹتا چلا گیا اور جو اس زمین پر جھونپڑ یا
ڈالے اگلی فصل کی نگہبانی کر رہے تھے وہ ایسے ڈوبے کہ پتہ نہ چلا کہ
کہاں ڈوبے اور کب ڈوبے؟

اسے لوگ افراطِ زر یا اِن فلیشن کہتے ہیں۔

جو امیروں کو امیر تر کرتا ہے اور غریبوں کو غریب تر
جس سے کروڑپتی مل مالک آرب پتی بن جاتے ہیں اور ادنا درجے کا
کسان کھیت مزدور۔

جس سے منافع تیزی کے ساتھ بڑھتے ہیں قیمتیں زوروں میں چڑھتی
ہیں اور اُجرتیں دھیرے دھیرے۔

سکّے کی قدر وقیمت گر جاتی ہے اور مال کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے
جنھوں نے زر کی وحشی قوت کو بے لگام چھوڑ رکھا تھا وہ ۳۹ء سے
۴۸ء تک اِن فلیشن کے مزے لوٹتے رہے۔ ۴۸ء میں موج
سر سے گزر گئی۔ تو انھوں نے دیکھا کہ عوام کی غریبی ایسی منزل پر آگئی
ہے جہاں سے دریا سوکھنا شروع ہو گا۔

دریا سوکھنا شروع ہوتا ہے۔ مال پڑا ہے کوئی خریدار نہیں۔ زمین پڑی
ہے کوئی کاشتکار نہیں۔ محنت موجود ہے کوئی گاہک نہیں۔ اوزار پڑے
ہیں کوئی کاریگر نہیں۔

اب کی بار اجرتیں تیزی سے گرتی ہیں۔ قوتِ خرید اور زوروں سے
گرتی ہے اور منافع دھیرے دھیرے گھٹتے ہیں۔

سکّے کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے اور مال کی قدر وقیمت گر جاتی ہے۔

آس پاس کی فصلیں جلنے لگتی ہیں اور بڑے بڑے کاروبار خسارے
میں آکر دم توڑ دیتے ہیں۔

اسے لوگ کہتے ہیں معاشی بُحران، سلمپ، یا اکانومک کرائسس۔

جو امیروں کو بدحواس کرتا ہے اور غریبوں کو فاقہ کش اور قلاّش
جس سے کروڑپتی اجارہ دار جنگ، قتل، غارت گری اور فاشزم
کی حمایت پر اُتر آتے ہیں اور ادنا درجے کا محنت پیشہ آدمی اُدھر
جاتا ہے جدھر بھوک اُسے دھکیلتی ہے۔

جب پانی کی نایابی سے کھیت جل گیا تو کسان کیا کھائے گا؟
مردہ جانوروں کا گوشت، ورنہ منافع خوروں کے اَٹے ہوئے گودام
پہلی صورت کا نتیجہ ہے جنگی بھرتی، اخلاقی جرائم، اور فاشزم، دوسری
صورت کا نتیجہ ہے انقلاب۔
معاشی بحران میں پھنسے ہوئے ملکوں میں یا تو فسادی، فاشسٹی اور
جرائم پیشہ طاقتیں زور پکڑیں گی یا پھر انقلابی۔ اور آخر میں جس کا بھی
پلّہ بھاری رہے فیصلہ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔
دنیا میں پچھلے پینتیس (۳۵) برس کی تاریخ اسی ایک نکتے کی تفصیل ہے۔
سچ کہا تھا کسی نے کہ زر کا حد سے بڑھنا بھی بُرا اور گھٹنا بھی بُرا —
بلکہ بہت بُرا۔ کہنے والا افسوس یہ بتانے سے پہلے دنیا سے سدھار
گیا کہ زر کے اعتدال اور کنٹرول میں رہنے کو اشتراکی نظامِ معیشت
کہتے ہیں۔

دسمبر سنہ ۵۱ء

معمّے کا حل

مادام ابھی آئی تھیں، کاغذ کے کئی پرزے لئے ہوئے۔
یہ معمّے تھے جن کے حل بھیجنے کی آخری تاریخیں قریب ہیں۔
مجھ سے کہنے لگیں: "نہ معلوم خدا کس وقت مہربان ہو جائے
آج کل میں بھی بے کار ہوں، میرے شوہر بھی بے کار ہیں۔ ہم دونوں
معمّے حل کرنے میں دماغ لگاتے ہیں۔ یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔
نہ جانے خدا کس وقت مہربان ہو جائے اور پھر یہ بھی ہے کہ معمّہ حل
کرنے میں بے کار وقت اچھا کٹتا ہے۔"

جب "خیاباں" ماہنامے کی مالی حالت ڈانوا ڈول ہونے لگی
اور میں نے اس کے پڑھنے والوں سے مشورہ مانگا تو کسی خیر اندیش
نے لکھا کہ آپ اپنے پرچہ میں معمّے جاری کر دیجئے۔
اب مادام سمجھاتی ہیں کہ معمّے بھرا کرو کسی دن ایکا ایکی بہت بڑی
رقم چھپر پھاڑ کر ٹوٹ پڑے گی۔ نہ جانے کب خدا مہربان ہو جائے
اور پھر بے کار وقت بھی آسانی سے کٹ جاتا ہے۔

آج کل بے کاری، افلاس اور مندی کا زمانہ ہے۔ سماج کی مشین ایسی بے رحمی سے چل رہی ہے کہ لوگوں کو ہر ایک آنے والی کل کی طرف سے بے چینی ہے۔ چناں چہ معمّوں کے خانے، گرجاؤں مسجدوں اور مندروں کے احاطے، پیروں اور حاجیوں کے مزار اور مجذوبوں کے ڈربے خوب زوروں سے بھرے جا رہے ہیں۔ نہ جانے خدا کب مہربان ہو جائے اور پھر اس طرح بے کار وقت بھی آسانی سے کٹ جاتا ہے۔

مغربی یو۔پی میں (سنہ ۴۷ء) جب مسلمانوں پر زمین تنگ تھی جگہ جگہ کرفیو لگے ہوئے تھے۔ راستے بند، سڑکیں ویران، تجارتیں ٹھپ لوگ گھروں میں بے کار پڑے تھے۔ اس زمانے میں مجھے وہاں مسلم محلّوں کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئی۔

"مسلمانو! نماز پڑھو، خدا بڑا مہربان ہے۔"

میں نے دیکھا کہ کالجوں، یونی ورسٹیوں اور سرکاری ملازمتوں سے آئے ہوئے مسلمان گھروں میں بے کار پڑے تھے۔ ان میں سے اکثر نے قرأت کے ساتھ نمازیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کچھ نے ڈاڑھیاں رکھ لی تھیں اور کچھ تھے جو شدّت کے ساتھ کیرم بورڈ اور معمّے کی مشق میں لگ گئے تھے۔

نہ جانے خدا کب مہربان ہو جائے۔ اور پھر اس سے وقت بھی تو آسانی کے ساتھ کٹ جاتا ہے۔

معمّہ جاری کرنے سے مستقل آمدنی کا ایک نیا صیغہ کھل جاتا ہے۔
معمّہ حل کرنے سے ناگہانی آمدنی کی ایک اُمید بندھ جاتی ہے۔
نمازیں پڑھوانے اور عبادتیں کرانے سے مذہبی اِداروں کی آبیاری ہوتی ہے۔
نمازیں پڑھنے اور دعائیں مانگنے سے اچانک مراد ملنے کی آس لگی رہتی ہے۔
نہ جانے خدا کب مہربان ہو جائے۔ اور پھر اس سے وقت بھی خوب کٹ جاتا ہے

مستقبل کی طرف سے بے اطمینانی جتنا زور پکڑے گی۔ زندگی کے موجودہ حالات جس قدر غیر یقینی ہوں گے بھوک اور بے روزگاری کے بادل جب تک اس طرح منڈلائیں گے کہ آدمی اُن کے آگے بے بسی محسوس کرنے لگے اس وقت تک اور اسی لحاظ سے عبادتوں اور معمّوں کا زور رہے گا۔ یہ ہو رہا ہے اور یہ ہوتا رہے لیکن جس دن انسان میں آنے والی کل کے متعلق بے اطمینانی کی جگہ عزم اور یقین پیدا ہوا جب روٹی اور روزگار کی طرف سے سکون ہوا۔ اور مجہول فرصتیں کاروباری مصروفیت میں بدل گئیں اس دن یہ سارے گھروندے بیٹھ جائیں گے خود بخود۔ یہ ہو رہا ہے اور یہ ہو گا۔
غالباً میں نے ایک بنیادی معمّے کو حل کر لیا ہے۔ مگر میرا انعام؟

فروری سنہ ۵۲ء

اپنی شکست کی آواز

آج ایک ایسی بات ہوئی کہ نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

الٰہ آباد کا واقعہ ہے، وہ ایک پرانے باوقار خاندان کا آخری چشم و چراغ ہے۔ وہ آج بھی ان بلند و بالا دیواروں کے سائے میں پڑا رہتا ہے جنھیں پردادا نے محل کہہ کر تعمیر کرایا تھا۔ محل تعمیر ہو رہا تھا کہ پردادا سدھار گئے۔ جو سامان جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ مٹی، سیمنٹ اور چونے کے ڈھیر پر اور دیواروں پر کائی جمتی چلی گئی۔ پوتے نے ان دیواروں کو کائی سمیت رہن کر دیا۔

کل اُس رہن کے بے باق ہونے کی آخری تاریخ ہے۔ سیٹھ جگت نرائن آئیں گے۔ عدالت کے آدمی اُن کے ساتھ ہوں گے۔ یہ محل اور اس کا تمام سامان بحق جگت نرائن ضبط ہو جائے گا اور اُسے یہاں سے آخری بار کوچ کرنا پڑے گا۔

کل کی صبح ہونے سے پہلے اس نے سوچا لاؤ، آج ایک بار، جیسے بھی

بن پڑے اس محل کے در و دیوار کو قہقہوں کے ساتھ الوداع کہہ دیں
نہ جانے کس کس جتن سے اس نے کچھ روپیے قرض لئے۔ ایک کونے میں
پرانی بوتلیں اور شیشیاں اور ٹاٹ کی بوریاں پڑی تھیں ـــ وہ اس نے
احتیاط سے سمیٹیں اور پھیری والے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ ایسے ایسے
نازک مزاج جوتے جن کے ماتھے پر ڈامر کی سڑک کو دیکھ کر شکن پڑتی
تھی کسی زمانے میں ـــ وہ بھی اس نے ٹاٹ کی بوری میں لپیٹ
کر رخصت کر دیئے۔ اور اس طرح جب قطرہ قطرہ ایک دریا بن گیا اور
پورے دس روپے جمع ہو گئے تو وہ سیدھا سِول لائن گیا، اور
"وائن مرچنٹ" جگت نراین کی دوکان سے ایک پوّا لے آیا۔

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

وہ اپنی شیروانی کے دامن میں پوّا چھپائے ہوئے خوش خوش چلا
آرہا تھا۔ اس نے آنے والی کل کی فکر کو اس نیم جاں بوتل کے تصور
میں غرق کر رکھا تھا کہ بازار کے کونے پر مڑتے وقت ـــ عین کوتوالی
کے سامنے کسی قرض خواہ نے اُسے زور سے آواز دی۔

وہ بے اختیار مُڑا اور قرض خواہ کی ناوقت صورت دیکھ کر وہ ایسا
گھبرایا کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔
بوتل چھوٹ گئی۔

انگور کا لہو بازار کے پتھریلے فرش پر رواں ہو گیا۔ اور آخری کائنات

عیش بھی خاک میں مل گئی۔ شیشۂ دل چکنا چور ہوا۔ بوتل کے کئی رنگین ٹکڑے راہ روک کر لیٹ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کئی سکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑے رہنے کے بعد وہ ایک طرف تیزی سے جھکا، یہ بوتل کی پیندی والا ٹکڑا تھا جس میں اب بھی دو گھونٹ باقی تھے ہاتھ میں اٹھاتے اٹھاتے اس کے بھی دونوں ٹکڑے الگ الگ ہو گئے۔

اس نے ان کو پہلے بوسہ دینے کی کوشش کی اور پھر دونوں کو زور سے زمین پر پٹک دیا۔

سڑک کے دوسری طرف ایک کار بہت دیر سے ہارن دے رہی تھی ہارن بجانے والا بریک لگا کر اتر پڑا اور اس نے "سوگوار" کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا "میاں صاحب! یہ کانچ کے ٹکڑے ہٹاؤ راستے سے۔ ان سے ٹائر کو نقصان پہنچا تو تم ذمہ دار ہو گے۔ اور اس طرح شارع عام پر بوتل پھوڑنا بھی جرم ہے۔ سمجھے؟"

جواب میں مجرم کے پاس دو اداس آنکھیں تھیں اور ایک نیم خند

۲ر جولائی ۵۲ء

چین اور روس

آج اختر سعید خاں تعجّب کر رہے تھے کہ:

پروپگنڈا انقلابِ روس کے خلاف بھی ہوا اور انقلابِ چین کے خلاف بھی۔ لیکن انقلابِ روس کے نام سے لوگ جتنا بدکتے ہیں اتنا وہ انقلابِ چین سے نہیں بدکتے۔ حد ہے کہ بعض وہ لوگ بھی جنھیں کمیونزم کا لفظ کاٹنے کو دوڑتا ہے سُرخ چین کا تذکرہ بڑے زور شور سے کرتے ہیں۔

میں نے زرا بلند آواز میں سوچا کہ:

کچھ تو اس کی وجہ یہ ہی کہ چین کا نام ہندستانی مزاج سے بہت قریب ہے زیادہ قریبی رشتے کی یاد تازہ کرتا ہے اور ہمسائگی کے برادرانہ جذبے کو اُبھارتا ہے۔ صدیوں سے ہندستانیوں اور چینیوں کے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ آمد و رفت رہی ہے اور قومی عادات میں بھی بہت سی مشترک باتیں ہیں۔

لیکن ایک بڑی وجہ اور بھی ہے۔

چین کا انقلاب جن حالات میں ہوا وہ روسی انقلاب کے حالات سے

مختلف تھے اور موجودہ ہندستان کے حالات سے قریب تر۔
چین کے انقلاب کو مقامی سرمایہ داری اور مذہبی اقلیتوں سے سامنے کی ٹکر نہیں لینی پڑی۔ روسی انقلاب کو ان سے ٹکر لینی پڑی تھی۔
چین کا انقلاب، روسی انقلاب کے تیس ۳۰ سال بعد مکمل ہوا۔
چین کا انقلاب روسی انقلاب کے تیس ۳۰ برس بعد کی منزل ہے۔
چین کا انقلاب روسی انقلاب کے کاندھے پر کھڑا ہے۔
جس طرح انقلابِ روس، انقلابِ فرانس کے کاندھے پر کھڑا ہوا

انقلابوں کی عمارت منزل بہ منزل تعمیر ہوتی گئی ہے۔
ہر نئی منزل پچھلی منزل کی بلندی پر تعمیر ہوئی ہے۔
اور انقلاب کے پچھلے تجربوں سے سیراب ہوئی ہے۔
یہ اسی طرح تعمیر ہوتی اور سیراب ہوتی چلی جائے گی
انقلابوں کی تاریخ میں بھی اِرتقا کا عمل جاری ہے
اور اسی طرح جاری رہے گا۔
انقلاب ایک ناگہانی ہنگامہ نہیں ہے، عمل کا ایک سلسلہ ہے۔
انقلاب سماج کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہے، سنگِ میل ہے۔
انقلاب، رک جانے کا مقام نہیں ہے، بڑھ جانے کا موڑ ہے۔
"قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں"۔

۱۵ مئی ۱۹۵۱ء

کونین مکسچر

ضیاء القاضی بھلے مانس قسم کے مسلمان ہیں۔
آج کہنے لگے: "صاحب آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پیغمبر سچے تھے اور وہ جس طرح سوچتے سمجھتے تھے اور جو انھیں بذات خود محسوس ہوتا تھا وہی کہتے بھی تھے تو پھر آپ رسُولَ اللہ کے اس قول کے آگے سر کیوں نہیں جُھکاتے؟"

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًاؕ

میں نے کہا: برادر! مجھے اس قول کی سچائی میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے۔ رسُول نے جب محسوس کیا کہ وہ جو کچھ امت کو دے سکتے تھے دے چکے، تمام کڑیاں جوڑ چکے اور اب کوئی نئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی اور نہ کسی ترمیم کی ضرورت باقی ہے تو انھوں نے کہا: آج تمھارا دین مکمل ہوتا ہے۔ لو۔ اور اس پر پوری طرح عمل کرو۔
یہ بھی واقعہ ہے کہ جس سماج کو وہ دین دیا گیا اس کے لئے وہ بالکل مکمل تھا اور ایک حد تک اس کا علاج بھی تھا اور یہ بھی دینے

والے کی سچائی تھی۔

فرض کیجیے ایک ڈاکٹر ہے۔ آپ کو بخار چڑھا۔ آپ اس کے پاس دوڑے ہوئے گئے۔ اس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ ٹمپریچر دیکھا۔ پوچھا۔ رات کب سوئے تھے؟ سونے سے پہلے کیا کھایا تھا؟ یہ نزلہ کب سے ہے؟

اس نے اندازہ کر لیا کہ آپ کا بخار دراصل غلط خوراک کا، ناوقت سونے کا اور قبض کا موسمی اور معمولی اثر ہے۔ ڈاکٹر نے ایک مکسچر کا نسخہ آپ کے حوالے کیا جس میں کچھ کونین تھی، کچھ پیٹ صاف کرنے کے اجزا تھے۔ اور کچھ مدافعت کی قوت بڑھانے والے۔

مجھے اس ڈاکٹر کی سچائی میں شبہہ کیوں ہونے لگا بھلا۔ مرض جتنا سادہ تھا اس کے لئے ویسی ہی سادہ سی دوا اس نے پیش کر دی اور کہہ دیا کہ تمھارے بخار کا بس یہی علاج ہے۔ یہ نسخہ پی جاؤ اور فلاں فلاں پرہیز کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ اس نسخے سے آپ کے بخار کو فائدہ بھی ہوا۔ اب تو ڈاکٹر کی تشخیص میں کوئی شبہہ کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

زمانہ گزرتا گیا۔ آپ مختلف حالات میں رہے۔ مختلف ملکوں کے موسموں میں زندگی بسر کی۔ نئی الجھنوں اور نئے مصائب سے آپ کو گزرنا پڑا جن کا آپ کو گمان بھی نہیں تھا۔ اتفاقات دیکھیے کہ آپ کا جسم اندر ہی

اندر گھلتا رہا۔ قوتِ مدافعت کمزور ہوتی گئی۔ اور کھانے کے یا ہوا کے ساتھ دق کے جراثیم آپ کے جسم میں داخل ہو گئے۔ خون بگڑ گیا اور معدے اور جگر کا فعل خراب ہو گیا اور پھر ٹمپریچر رہنے لگا۔ آپ نے ویسی ہی حرارت محسوس کی۔

آپ پھر اسی مطب پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تو سدھار گئے دنیا سے۔ آپ واپس آئے اور وہ تیرہ برس پہلے کا استعمال کیا ہوا نسخہ تلاش کرنے لگے۔ نسخہ احتیاط سے رکھا تھا، مل گیا۔ آپ نے سوچا۔ اب پھر وہی کونین مکسچر پی جاؤں گا۔ بخار جاتا رہے گا اور شفا ہو جائے گی۔

راستہ میں ایک ڈاکٹر سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کو اپنے مطب میں لے گیا۔ آپ کی نبض دیکھی، نئے آلات سے معدے، جگر اور آنتوں کی تحقیقات کی۔ پھیپھڑے دیکھے خون اور بلغم ٹیسٹ کیا اور اپنا فیصلہ سنایا کہ بھائی میرے! یہ بخار تو ایک پیچیدہ مرض کی علامت ہے۔ تم بفضیب دشمناں دق کے دوسرے اسٹیج میں ہو۔ اب "کونین مکسچر" سے کام نہیں چلے گا۔

مرض کی اصلیت بدل گئی ہے۔ علاج کی بنیاد بھی بدل جائے گی۔

ذرا سوچئے۔ اگر آپ نئے آلات کی اس نئی تحقیقات کو نہیں مانتے جو آدمی کی سالہاسال کی جانفشانی کا نتیجہ ہے اور قدیم طب کی تمام ترقیوں

پر ایک نئی ترقی ہے تو یہ قصور کس کا ہے؟ اگر آپ اصرار کئے جا رہے ہیں کہ نہیں بخار چاہے کیسا ہی ہو۔ ہر قسم کے بخار اور ہر مرض کے بخار کا علاج بس وہی تیرہ برس (یا تیرہ سو برس) پہلے کا نسخہ کافی ہے اور مکمل ہے تو دراصل آپ موجودہ ڈاکٹر کی سچائی کو تو جھٹلا ہی رہے ہیں لیکن ٹریجان کی بات یہ ہے کہ آپ اس پچھلے ڈاکٹر کی سچائی کو بھی ملیامیٹ کر رہے ہیں۔

پھر سوچئے اگر آپ کہیں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہوتے اور یہی رویہ آپ کا رہتا تو یقیناً آپ اُس ڈاکٹر کی نباضی سے، اس کی تشخیص اور اس کے علاج سے بھی انکار کر دیتے بالکل اسی طرح (آخر وہ بھی کے بھائی بند ہی تو تھے جو قرآنی آیات پڑھے جانے کے وقت کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتے تھے۔)

جو لوگ آج سوسائٹی کے مرض کا علاج ہندو راج، یا اسلامی حکومت کے نسخے سے کرنا چاہتے ہیں اُن سے کہیئے کہ:

بھائی۔ اب تو مرض بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ یہ صنعتی سرمایہ داری، اجارہ داری شہنشاہیت اور ان سب کی آخری شکل فاشزم کے جراثیم ہیں جو تمہارے پھیپھڑوں کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔ دق کا یہ مرض تم کو اس وقت نہیں لگا تھا جب کو نین مکسچر دیا گیا تھا۔

مرض کی اصلیت بدل گئی ہے۔ علاج کی بنیاد بھی بدل جائے گی۔

۲۵ مئی سنہ ۵۲ء

سمجھوتہ

کلکتہ میں ٹھہرنے کے لئے ایک دوست نے انھی کے گھر کا پتہ دیا تھا۔ اور پہلی ہی رات جب میں سونے کے ارادے سے مہمانوں کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پر لیٹا تو تکیے میں تازہ بسائی ہوئی خوشبو نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ بڑے خلیق، مہربان اور سلیقہ مند ہیں۔

دوسرے دن سے نئے رشتے تلاش کر لئے گئے اور میں نے ان کی بیوی کو بھابھی بنا لیا اور انھوں نے مجھے بھائی۔

تیسرے دن اتوار تھا، دوپہر کے کھانے پر میں اس تصوّر سے لطف لے رہا تھا کہ میرے میزبان کتنی جلدی بے تکلف ہو گئے ہیں۔ کہ اتنے میں بھابی جان کے اور کئی بھائی بھی ایک ایک دو دو کر کے آ گئے۔ سب کے سب تقریباً ہم عمر تھے، یہی اندازاً ۱۸ اور ۲۵ سال کے درمیان۔ سب خوش پوش اور خوش باش۔

یہ کون ہیں؟ سرش! آپ؟ ساہو۔ آپ رحمان صاحب۔ ڈاکٹر ہیں آپ؟ آپ کو نہیں جانتے مشہور آرٹسٹ کٹ منھیا۔

چوتھے دن جب میں نے دیکھا کہ "بھابی" ان میں بعض پر رحم کھاتی ہیں

بعض کا احترام کرتی ہیں بعض کے لئے آنکھیں بچھاتی ہیں اور بعض سے محض خدمت لیتی ہیں تو میں نے اپنا ضمیر کریدنے کے لئے اُلٹے ابھی سے سوال شروع کر دیے۔

"یہ سربش کون ہے؟"

"ارے وہ ——— وہ تو پہلے ڈائرکٹر برداکا اسسٹنٹ تھا۔ بے چارہ دو برس سے بے کار پھر رہا ہے۔ دیکھو صورت شکل ایسی ہے کہ ایک چانس مل گیا تو ہیرو بن جائے گا ——— غریب آج کل میرے کام میں ہاتھ بٹا دیتا ہے۔ ایسا وفادار بھائی خدا ہر ایک بہن کو دے، رات کو سونے سے پہلے تمام برتن دھو مانجھ کر رکھتا ہے اور باورچی خانہ کو صاف کرنے کے بعد سونے جاتا ہے"۔

"یہ ساہو اور سربش صورت شکل سے بہت قریب کے رشتہ دار یا بھائی معلوم ہوتے ہیں" ——— میں نے دوسرا سوال آہستہ سے آگے بڑھایا۔

نہیں نہیں ساہو تو بنگالی ہے اس کے دادا بہت بڑے افسر تھے اس کے ماں باپ ڈھاکے میں رہ گئے انھوں نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔ بھائی مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ شریف آدمی اور یوں مارا مارا پھرے۔ میں نے تمھارے بھائی سے کہا " ساہو کو یہیں بلا لو۔ جب تک قاعدے سے روزگار نہ ملے، کم سے کم اسے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے گا ...... تاش کھیلنے میں بے ایمانی کرتا ہے ویسے ساری باتیں اچھی ہیں۔ میرے سامنے نظر اونچی

نہیں کرتا۔ بھائی سچ پوچھو تو اپنوں سے یہ غیر اچھے ہیں۔ وقت پڑنے پر اپنوں سے زیادہ کام آتے ہیں۔"

بھابھی کے سارے بھائی تندرست اور نوجوان تھے اور ان میں سے کئی ایسے بھی تھے جو اپنی آمدنی کا سارا حساب جمع خرچ بھابھی کے ہاتھ میں رکھتے تھے گھر میں انھی کا اقتدار تھا۔ ان میں سب سے بڑا بھائی سب سے زیادہ نیک، مہذب اور بے زبان تھا۔ اور حالاں کہ ڈاکٹروں نے اُسے دق کے پہلے درجے کا مریض بتایا تھا لیکن بھابھی کی اطاعت اور خدمت گزاری کا جذبہ اُسے اتنی مہلت نہ دیتا تھا کہ وہ دو دن کے لئے بھابھی کو تنہا چھوڑ کر کسی پہاڑی مقام پر چلا جائے۔

بھابھی کے شوہر بڑے نرم، معتدل، عالی ظرف، مہذب اور کماؤ شوہر تھے۔ کلکتہ سے باہر ان کے دو ہوٹل چل رہے تھے۔ لکھنؤ کی ریس میں ان کے گھوڑے دوڑتے تھے اور بھی اِدھر اُدھر کی کافی آمدنی تھی، وجیہہ آدمی تھے۔ معززین شہر میں ان کا اچھا خاصہ رسوخ تھا۔ بے سہارا لڑکیوں کو ملازمتیں دلوانا۔ ہوٹلوں میں ان کے لئے رہنے سہنے کا بندوبست کرنا۔ فلمی صنعت کے لئے بہتر چہروں کا انتخاب کرانا اور جن کا انتخاب ہو چکا ہو انھیں خراب آدمیوں کی صحبت سے بچا کر زندگی کے میدان میں آگے بڑھانا ایسی قومی خدمات تھیں جن کی وجہ سے وہ ایک بار

اسمبلی کے ممبر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ کسی زمانے میں کلبوں اور ناچ
گھروں میں ان کے نام کا سکّہ چلتا تھا لیکن چوں کہ حُسن کی تیز دھوپ
میں ایک عمر گزارنے سے ان کے بال سفید ہو چلے تھے اس لئے انھوں
نے جہاں بالوں کو خضاب کرنا شروع کیا وہاں یہ بھی کیا کہ بے سہارا
لڑکیوں کی سرپرستی کی ذمہ داری اوڑھ لی اور بہنیں اور بیٹیاں بنانے لگے
ان میں سے کئی بہنیں اور بیٹیاں ایسی تھیں جن کے اُٹھنے بیٹھنے اور وقت
پڑے تو سونے جاگنے کے لئے مردانے مکان میں دو کمرے محفوظ رکھے گئے
تھے۔ بھابھی کی طرف سے ان کے شوہر کی بہنوں اور بیٹیوں کو درجہ
بدرجہ تواضع اور خاطر مدارات بھی حاصل ہوتی رہتی تھی۔ بھابھی اکثر ان
کی دل داری اور تفریح کی خاطر کبھی پکچر ہاؤس کبھی ہگلی، کبھی ہاوڑہ برج
کبھی کلکتہ میدان، کبھی ڈلہوزی چوک کی شاندار دکانوں میں لئے
پھرتی تھیں۔ اتنی احتیاط البتہ وہ کرتی تھیں کہ ایسے موقعوں پر اپنے
بھائیوں میں سے کسی کو ساتھ نہیں لے جاتی تھیں۔

پاس پڑوس کے لوگ اس گھر کو مثال کے طور پر پیش کیا کرتے تھے کہ
رواداری اور کُنبہ پروری سیکھو تو ان کے گھر سے سیکھو کہ میاں بیوی کے
سارے رشتہ دار بس ایک آدمی کے دم سے پل رہے ہیں اور ہنسی خوشی
دن گزر رہے ہیں۔

جہاں بہت سے برتن ہوں گے وہاں کھڑکا بھی ہوگا ہی بہر حال۔

چناں چہ ایک رات کھڑکا ہو گیا۔ مجھے اپنے اخبار کے نام رپورٹ تیار کرنی تھی اور جس کمرے میں میرا قیام تھا وہاں کئی اور قیام بھی تھے۔ میں اس خیال سے کہ آج بھائی صاحب کا کمرہ خالی ہے وہاں تنہائی میں رپورٹ لکھ سکوں گا، قلم کاغذ لے کے آدھی رات کو اس طرف چل دیا۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ تاریکی تھی اور مشتبہ آوازیں تھیں میں فوراً واپس آیا اور بھابھی کو مطلع کیا کہ بھائی صاحب کے کمرے میں شاید چور گھس آئے ہیں۔ وہ دوڑی ہوئی آئیں۔ انھوں نے جو کمرہ کھلوا کر دیکھا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ صرف میاں سرفراز سو رہے تھے اور ان کے سرہانے کسی کا دوپٹہ پڑا رہ گیا تھا۔ جو بعد میں معلوم ہوا کہ ہاجرہ بیٹی دن میں کسی وقت وہاں بھول آئی تھیں۔
بھابھی نے اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ ہاجرہ بیٹی اتنی سی بھول پر پورے قبیلے سے خارج کر دی گئیں، اور بھائی کو دوسرے ہی دن ڈاکٹر مکرجی کے اسپتال بھجوا دیا گیا علاج کے لئے۔

میں نے سوچا کہ اللہ اللہ یا تو وہ شور اشوری تھی یا یہ بے نمکی؟ یا تو وہ ناز برداریاں تھیں یا اتنی بے مروتی۔ خیر بات آئی گئی ہوئی۔ تیسرے دن رات کو بھائی صاحب بھی دورے سے واپس آ گئے۔ ان کے آنے کے بعد جانے کیا ہوا کہ وہ دونوں تو پھر سے اپنی اپنی جگہ بحال کر دیے گئے لیکن مجھے بھابھی نے الگ بلا کر کہا: "بھائی معاف کرنا ایک بات کہوں تم سے۔ تم کہیں اور رہنے کا انتظام کر لو۔"

اب بھی جو لوگ ہمارے مشترکہ احباب ہیں جب وہ ملنے جاتے ہیں تو بھابھی اُن سے

میری تعریف کرتی ہیں کہ وہ آدمی بہت شریف انسان ہے۔ بے چارہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ میرا بس چلتا تو عمر بھر نہیں اپنے پاس رکھتی لیکن کیا کروں گھر میں ویسے ہی جگہ کم ہے اور پھر اُسے پڑھنے لکھنے کے لئے الگ کمرہ چاہیئے۔

دیر تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ کون سی خطا تھی جس پر بھابھی اور بھائی دونوں نے تھوڑی دیر آپس میں بات کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ میرا وہاں سے علاحدہ ہو جانا ضروری ہے

اکتوبر ....ء

مطالعہ

آج وہ سامنے بیٹھی تھیں جب میں اڈگر ایلن پو کے تنقیدی مضامین کے دو صفحے پڑھ رہا تھا انھوں نے کہا: اب میں سمجھی۔ آپ اپنے مطالعے کی کمی کا رونا کیوں روتے ہیں۔ دراصل آپ کے پڑھنے کی رفتار بیل گاڑی کی سی ہے۔ خیال رہے کہ بیل گاڑی سے آج تک کسی نے دنیا کا سفر نہیں کیا ہے"

میں نے کہا: ہوائی جہاز سے جو لوگ اٹھارہ گھنٹے کے اندر کلکتہ سے لندن کا سفر کرتے ہیں ان کا سفر درمیانی دنیا کے مطالعہ سے محروم رہتا ہے۔ تم نے میکالے کا وہ قول تو پڑھا ہوگا۔ "جلدیں کی جلدیں تیزی سے پڑھ جانے کے بجائے ایک صفحہ خوب سمجھ کر پڑھ لینا بہتر ہے"

مجھے بوولٹر کی ایک تحریر یاد آئی جس میں بوولٹر نے کتابوں کو عورتوں سے تشبیہ

دی ہے اور اس کی تشریح بڑی دل چسپ کی ہے۔

بودلیئر تو جیمز فرانس کے زوال کا ترجمان اور اسی کی پیداوار ہے! اس کی خوب صورت بات میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ہوتا ہے جس سے تندرست آدمی کو گھن آجائے۔

بیکن نے زیادہ مکمل بات مطالعہ کے سلسلے میں کہی جب اس نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ "کچھ کتابیں صرف چکھنے کے لئے ہوتی ہیں کچھ نگل جانے کے لئے اور کچھ ایسی جنھیں چبا چبا کر ہضم کیا جاتا ہے"۔

لیکن غور کرتا ہوں تو یہ بات مجھے ان لوگوں کے لئے صحیح معلوم ہوتی ہے جن کا مطالعہ ایک ترتیب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر مطالعہ اس طرح ہوا ہے کہ آدمی نے پہلے ایک ایک موضوع کو چنا۔ اس موضوع پر ابتدائی اور بنیادی نکتوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، پھر ایک سلسلے سے ان بنیادیات کے سارے پہلو کھنگال ڈالے اور جی بھر کر مطالعہ کر لیا تو سمجھو اب اس کا مطالعہ بیکن کی طرح کا ہوگا۔ کچھ کتابوں کے اندر اسے صرف چھلکا نظر آئے گا۔ کچھ میں چھلکے کے ساتھ گٹھلی بھی ہوگی۔ کچھ میں صرف گودا ہی گودا زود ہضم، اور کچھ میں دیر ہضم مغز ہی مغز۔

ہندستان میں والٹ مین اور ایران میں سعدی کے مطالعے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن ایک فرق کے ساتھ ـــــ کہ ان دونوں کے مطالعے کو عمر کا وہ حصہ ملا جب کتاب سے زیادہ اہمیت مشاہدے کی ہو جاتی ہے جب حافظے سے زیادہ نگاہ تیز اور صاحب ادراک ہوتی ہے۔

برنارڈ شا بچپن سے مطالعے کے دھنی تھے اور ان کے مطالعے میں بڑی

حیرت ناک ترتیب موجود تھی۔ جہاں چہ ۳۰-۳۳ برس کی عمر سے اُن کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بعض کتابوں کو گھنٹے آدھ گھنٹے میں پڑھ پڑھا کر اُلٹ دیا کرتے تھے اور بعض کے پڑھنے میں (یا چبانے میں) کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اگرچہ پہلی قسم کی کتابیں اتنی تعداد میں آتی تھیں کہ وہ کپڑے بدلتے وقت انھیں سنگار میز پر کھول کر رکھ دیتے تھے۔ کپڑے بدلنے کے دوران اُن پر نظر دوڑاتے جاتے اور ایک کے اوپر ایک کتاب کی تہ جمتی چلی جاتی۔ بعد میں یہ پورا ڈھیر وہاں سے سرکا دیا جاتا تھا۔

امام غزالی بلا کے ذہین آدمی تھے مگر انھوں نے مطالعے کے لیے عمر کا ایک خاص حصہ مخصوص کر دیا اور اس زمانے کے مطالعے کا جو نچوڑ انھوں نے "احیاء العلوم" کی صورت میں پیش کیا ہے وہ ایسا تھا کہ اسے قرآن کے بعد دوسرا درجہ دیا گیا۔ جب وہ افریقہ کے شمالی جنگلوں اور بستیوں کا طویل سفر کر رہے تھے تو صرف گنی چنی کتابوں کا ایک ڈھیر اُن کا زادِ سفر تھا۔ وہ زادِ سفر "احیاء العلوم" کے کام آیا۔

بعض لوگوں کو مطالعے کے لئے ایسی خاموشی اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے جہاں پرندہ پر نہ مار سکے اور بعض لوگوں کا مطالعہ انھیں اپنے اندر ایسا غرق کر لیتا ہے کہ سر پر ڈھول بھی بجاؤ تو انھیں خبر نہ ہو۔ پہلی قسم میں ابن سینا اور گرودیو آتے ہیں۔ دوسری قسم میں گورکی اور نہ جانے کتنے بے سر و سامان صاحبانِ فکر۔

لیکن ہم لوگوں کی بڑی مصیبت ہے جن کی تعلیم ناقص، مطالعہ ناقص اور حالات ناقص تر نہ کوئی ترتیب ہے نہ سکون، نہ مطالعے کی کوئی بے پناہ تحریک۔

میں جب دل خواہ کتابوں کا مطالعہ کرنے بیٹھتا ہوں تو میری حالت کبوتر کی سی ہوتی ہے کہ وہ جب پانی کے ذخیرے سے پیاس بجھانے آتا ہے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی چونچ پانی میں ڈالتا ہے۔ لمحہ بھر بعد چونچ نکال لیتا ہے اور آسمان کی طرف منہ کرتا ہے۔ چند قطرے جب حلق سے نیچے اُتر چکتے ہیں تو پھر ادھر اُدھر دیکھتا ہے پھر چونچ ڈالتا ہے، پھر نکال لیتا ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ چند قطرے اپنے ننھے سے پوٹے میں ٹپکا لینے کے بعد سیراب ہو جاتا ہے۔ اگلی پیاس تک۔

لیکن شیر کی طرح خوب کھل کر سیراب ہونا کچھ اور بات ہے۔ اس کے لئے شیر کا سا چوڑا دہانہ ہونا چاہیئے۔ شیر کا سا جگرا چاہیئے اور اسی کا سا یقین اور اعتماد۔ انہماک اور حوصلہ۔

یہ انہماک، یہ یقین اور حوصلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے آدمی میں جب وہ برسوں ایک سسٹم اور ایک سائنٹفک ترتیب کے ساتھ مطالعے کی ریاضت کر چکا ہو۔

مطالعہ بھی اپنے نشو و نما کے لئے ایک خاص ترتیب اور خاص محنت چاہتا ہے۔ یہ نہ ہو تو کچھ نہیں۔ پیوند رہ جاتے ہیں جن کا بخیہ ذرا سی کش مکش میں اُدھڑ جاتا ہے۔

۲ رمئی ۵۲ء

بکروں کا لداؤ

"جی ۔آئی ۔پی" ریلوے لائن [۵۱] پر شہر سے چالیس میل کے فاصلے تک نئے کارخانے تعمیر ہو گئے ہیں۔ مزدوروں اور کلرکوں کے ہجوم بڑھ گئے ہیں۔ ان کے لئے تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی ضرورت ہی اور ڈبے کم ہیں۔ سو مسافروں کی جگہ تین تین سو مسافر ایک ڈبے میں گھستے ہیں۔ جب اندر سانس لینے کی جگہ نہیں رہ جاتی تو کچھ لوگ ہر ڈبے کے دروازے پر لٹکے رہ جاتے ہیں۔ دروازے پر لٹکنا جرم قرار دے دیا گیا اور "مجرموں" کو روزانہ سزائیں دی جانے لگیں۔ جن کو ریلوے کے مجسٹریٹ سزا نہ دے سکے ان میں سے بعض کو موت کے فرشتے نے سزا دی۔ وہ باہر گرے اور موت و حیات کی کشمکش سے نجات پا گئے۔

نئے ریلوے وزیر نے نیا پلان منظور کر دیا۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری، اور مسافروں کی حفاظت کا انتظام بھی ہو جائے۔

---

۵۱ اب وہ سینٹرل ریلوے ہو گئی ہے۔

چند ہفتوں کے اندر ہر ایک تھرڈ کلاس کی چھت میں لوہے کے ڈنڈے ٹھونک دیے گئے اور ان ڈنڈوں میں سیکڑوں لوہے کے کڑے یا ہُک لگا دیے گئے کہ ان کڑوں میں اپنے اپنے ہاتھ پھنسالو اور اطمینان سے لٹکے ہوئے چلے جاؤ۔

یہ کڑے شکل و شباہت میں ویسے ہی ہیں جیسے قصائیوں کی دوکانوں پر لگے رہتے ہیں کھال کھینچنے کے بعد بکرے لٹکانے کے لئے۔

میں دیکھتا ہوں، تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ:

صبح ۵ بجے سے دن کے ۱۱ بجے تک ہزاروں کلرک اور مزدور اُن کڑوں میں لٹکے ہوئے، شہر کی منڈیوں اور آڑھتوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ایک ایک اسٹیشن سے اُجلی اور میلی چمڑی کے بکرے۔

سینگ دار اور بے زبان بکرے۔

مہذب اور نامہذب بکرے۔

کڑوں میں لٹکا کر روانہ ہوتے ہیں اور کاروباری علاقے کی ایک ایک عمارت میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ پھر شام کو حفاظت کے ساتھ کڑوں میں لٹکا کر گوداموں کو واپس کر دیے جاتے ہیں اگلے دن کی دوکان داری کے لیئے۔

اسے کہتے ہیں شہریوں کی حفاظت کا انتظام

جنرل منیجر کہاں ہے؟

اُسے بلاؤ، مبارکباد دو۔ پلان کامیاب رہا۔

ریلوے وزیر کو سکرٹریٹ کی ٹھنڈی چھت کے نیچے سے لاؤ۔

کہو کہ جشن منائے۔ کفایت شعاری نے کمال کر دکھایا۔

سینما کے پردوں پر خواب کا رقص دکھانے والوں کو خبر کرو۔

لوہے کے کڑوں میں لٹکے ہوئے ہاتھوں کا یہ رقص اچھوتا ہے

فلمی شاعروں کو اُن کی موٹروں سے اُتار کر لاؤ

اُن سے کہو کہ گانے کی ایک سچوایشن یہ بھی ہے۔

خدا کو آسمان کے پردے پھاڑ کر باہر گھسیٹو

اور ___ جتاؤ ___ کہ دیکھ!

ابلیس کے ہاتھوں آدم کی توہین آج تک ہو رہی ہے۔

۹ر دسمبر ۵۱ء

آنسوؤں کا سیلاب

نہ جانے کیا سمے ہو گا جب غالب نے یہ شعر کہا تھا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ شعر، مجھے یقین ہے کہ کسی تمنا کی ناکامی پر نہیں کہا گیا اور نہ اس کے پیچھے کسی ذاتی خواہش کی شکست چھپی ہے۔ اس شعر کو بس وہی دل سمجھ سکتا ہے جس میں درد ہوتا ہو۔ اتھاہ ہوتا ہو اور بے سبب ہوتا ہو۔

آج بڑے زمانے کے بعد ایک فرنچ پکچر دیکھی اور ہال سے نکلنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ سینے میں دھوئیں کے بادل اٹے ہوئے ہیں۔ کہانی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔

گاڑی میں بٹھانے کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا "کہیے آپ کو کہاں اتار دوں؟" میں نے کہا آپ اپنے بنگلے جائیے۔ میں راستے میں کسی جگہ گاڑی سے اتر جاؤں گا" اور ایک سنسان سے موڑ پر میں اتر گیا۔

میں دیر تک ایک نامعلوم سمت میں پیدل چلتا رہا۔ بڑے دنوں بعد بدلی گھر کر آئی ہے۔ تمنا تھی کہ کھل کر برسے۔ کوئی دس بارہ برس ہو گئے، آنکھ سے آنسو ٹپکنا مشکل ہو گیا ہے۔ آنسو خشک ہو جانا، ہو نہ ہو ایک کمزوری ضرور ہے۔

کبھی کبھی دردناک واقعے پر یا بس یوں ہی کسی بات پر سینے میں بدلیاں سی اٹھتی ہیں اور آنکھوں تک آنے سے پہلے ہوا ہو جاتی ہیں۔ بھلا اس سے بڑھ کر بے چارگی کیا ہو گی۔ جو آدمی اپنی نہ سہی، پرائی مصیبت پر بھی کھل کر نہ رو سکے وہ اپنی یا دوسروں کی مسرت پر جی کھول کر کیا ہنسے گا۔

اور جس کے جیون سے ہنسنے رونے کی صلاحیت غائب ہو جائے اُس کا جیون کتنا روکھا پھیکا ہو گا۔

بہت جی چاہا کہ کسی ایسے گوشے میں جا بیٹھوں، جہاں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، سوکھی ندی میں رَو آئے اور اگر گزر جائے۔ مگر توبہ۔

اس شہر میں جہاں بے حس سے بے حس آدمی اپنے دل میں ناکامیوں کے تہ بر تہ داغ لئے پھرتا ہو گا۔ جی بھر کر رو لینا بھی آسان نہیں، اور جی کھول کر ہنس لینا مشکل تر ہے۔

بَدلی برسے بغیر چھٹ گئی۔ اور مطلع صرف ابر آلود ہو کر رہ گیا۔

غالبؔ کہتے تھے کہ:

خاک کا رِزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

میں پوچھتا ہوں جو دریا قطروں میں ڈھلنے سے پہلے جذب ہو جائے وہ کس کا رزق ہے؟

شاید وہ خود رِزق نہیں بنتا بلکہ خون کے قطروں کو اپنا رِزق بنا لیتا ہے۔

جگرؔ پر ایسا عالم گزرا ضرور ہو گا جو انھوں نے یہ شعر کہا۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

مگر ایسا وقت صرف محبت میں ہی نہیں آتا نفرت میں بھی آتا ہے۔ محبت و

نفرت کے بغیر بھی آتا ہے لیکن ہاں ـــــ آتا ہے" انسان پر" ہی ۔ چوپایوں پر نہیں آتا ۔ میرا مطلب ہے کہ ہر آدمی پر یہ افتاد نہیں آتی ۔ اِس کے لئے :

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء

خلوص کی دورنگی

آج مجھے حسرت موہانی مرحوم بہت یاد آئے ۔

بے چارے کل سدھار گئے دُنیا سے ۔

ایسا مخلص آدمی بھی کم پیدا ہوتا ہے اور اتنا خلوص جس میں ہو وہ بہت کم مفید رہ جاتا ہے ۔

"دیکھتے جاؤ ۔ روپیہ اب کی میں نے جمع کر لیا ہے ۔ اسمبلی کا الاؤنس بچا بچا کر ۔ تھوڑا روپیہ اور ہو جائے تو میں اُردو کا مقدمہ "یو ۔ این ۔ او" میں لے کر جاؤں گا " یہ بات انھوں نے پچھلے سال ایک پرائیوٹ گفتگو میں کہی تھی ۔

بے چارے حسرت موہانی ، مخلص آدمی ۔

غور کرتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے کہ خلوص وہیں تک اچھی چیز ہے جہاں اُس کے بغیر کام نہ چلے اور جہاں اس کے بغیر بھی کام چلتا ہو وہاں خلوص بڑا نقصان دے جاتا ہے پہلی بات میں مسٹر جناح کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے ۔

اور دوسری بات میں حسرت موہانی کی ناکامی کا راز۔

اس راز کو مولانا ابوالکلام نے سمجھا اور جیت گئے۔

اسی راز کو مولانا محمد علی نے نہ سمجھا اور چت ہو گئے۔

ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک نے خلوص کی اس دو رنگی کو نہ مانا اور دربار اکبری سے نکالے گئے۔

شیخ مبارک کے ذہین بیٹوں نے اس کا گُر مان لیا اور پوری سلطنت کے ستون بن گئے۔

علی اور ابوذر غفاری نے اس گُر کو ٹھکرا دیا اور دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئے

عمر اور معاویہ نے اس کو رہنما بنایا اور ایک بڑی سلطنت کی داغ بیل ڈال گئے۔

کامل خلوص کے بغیر بھی مشن پورا کرنے کی راہیں بنائی گئی ہیں۔

کامل خلوص اور بے غرضی کبھی کبھی مشن کی کامیابی کا راستہ روک لیتی ہے۔

محمد تغلق اور ہمایوں سادہ لوح نہیں تھے مگر مخلص ضرور تھے۔

بابر اور اکبر مکار نہیں تھے مگر کامیاب ضرور تھے۔

خلوص دودھاری تلوار ہے' اس کا ہر وقت برہنہ رہنا بہت خطرناک ہے۔

اس کی دُہری دھار سے بڑے بڑے سورما زخمی ہوئے ہیں۔

خلوص کی تاریخ میں، بڑے بڑے عبرت کے مقام آتے ہیں۔

بے چارے حسرت موہانی مخلص آدمی۔ ۱۴ر مئی ۱۹۵۱ء

انتقام

روٹیاں سامنے رکھی تھیں اور بھوک کے باوجود کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا کھانے کو۔ میں نے ایک نوالہ توڑا تو اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے انھیں دال کے پیالے میں ڈالا لیکن ابھی کٹورے میں دال کے دانے تلاش کر رہا تھا کہ وہ سب وہیں گھل گئے اور پھر جو چیز حلق سے اتارنی پڑی وہ کچھ گرم نمکین پانی تھا، کچھ مٹی کنکر۔ کچھ روٹی کے ریزے۔

یہ دلی جیل کی ایک شام کا ذکر ہے جب ہم دس بارہ آدمی ننگی زمین پر کھانا کھانے کے لئے اکڑوں بیٹھے تھے، اور حوالدار بارک کے آہنی دروازے پر تالا اور زنجیر ٹھونک رہا تھا۔

بلراج ساہنی ہنس مکھ، زندہ دل اور کھرا آدمی ہے، اس نے کہا "یوں کب تک میناکاری کرو گے بادشاہو! پہلے روٹی منھ میں بھر لو، اوپر سے دال کا پانی۔ اتار جاؤ جیسے یہ جیل کے افسر ہمارے حصے کی دال اندر اتار گئے اور ڈکار تک نہیں لی پٹھوں نے۔

کامریڈ کھڑ ڈیکر نے اپنا موٹا چشمہ ناک پر درست کیا، چاندی کے سفید تاروں جیسی زلفوں پر ہاتھ پھیرا اور زور سے ہنس دیے۔

جگ موہن بھٹناگر نے اپنے برابر والے کامریڈ کی بچی ہوئی آدھی روٹی اپنے سامنے کھینچ لی اور گھڑ ویکر کی بے محل ہنسی پر خود بھی ہنسا "آج یہ سالے ہمیں ایسی روٹی کھلا رہے ہیں۔ کل جب ہماری باری آئے گی تو دیکھنا تم۔ میں تو بھیا سیدھا آنریبل جیل منسٹر کے بنگلے پر پہنچوں گا اور اس کی گدی میں ہاتھ دے کر منھ کھلواؤں گا کہ "لے بیٹا۔ اب تو کھا دہی روٹی"۔ یہ یو۔پی کی بولی تھی جس میں مطلب کم ہوتا ہے الفاظ زیادہ۔

"دہی روٹی کیوں، چمڑا منھ میں ٹھونسیں گے"۔ کوپر نے ایک ریمارک کا اضافہ کیا۔

بروہی کامریڈ کوپر تھا جو جیل کے بدمزا کھانے کے بعد منھ کا مزا درست کرنے کے لئے دودھ میں انڈا گھول کر پی لیا کرتا تھا۔

"ارے ان سے تو ایک ایک ظلم کا انتقام لینا پڑے گا۔ میں تو ایسا انتقام لوں گا جو اُن کی اولاد تک کو یاد رہے"۔ تشر دوار کے مرہٹا خون سے چھینٹے اُڑے۔

"کون اولاد؟ وہ جو تمھاری حلیف ہوگی اس سے انتقام لوگے تم؟ تم اور انتقام لوگے؟ کیوں کامریڈ"۔

انتقام کا لفظ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوئے تھے لیکن اب تک میں ضبط کئے ہوئے تھا۔ "جب تم انتقام لینے نکلو تو مجھے بھی خبر کر دینا۔ میں بھی جیل منسٹر کے بنگلے پر پہنچوں گا اور کہوں گا، "تشریف رکھیے آپ ہماری

حراست میں ہیں۔ دوسرا حکم آنے تک آپ کوٹھی سے باہر نہیں نکل سکتے اور نہ کسی سے مل سکتے ہیں۔ آپ کی جان، مال، اولاد سب محفوظ ہے۔ اور جب تک عوام کی عدالت میں آپ کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک آپ کے کھانے پینے کا خرچ ہمارے ذمہ رہے گا۔۔۔۔"

میں کچھ اور بولتا لیکن کسی نے زور سے کہا" شیم، شیم۔ بورژوا اخلاق کی ترجمانی ـــــ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا افسوس"۔

کامریڈ کھرڈیکر نے جلدی سے پہلو بدلا، ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں اور منھ کا منھ میں رہ گیا۔ وہ اس وقت تک خاموش رہتے ہیں جب تک ان کے دل کی بات کسی اور کے منھ سے نہ نکلے۔ بوڑھے کھرڈیکر کے چہرے پر کھردراپن اور بڑھ گیا اور وہ زور سے بولے:۔

"انتقام انتقام پکارو تو اس کا مطلب پہلے سمجھ لیا کرو برخوردار! لینن نے کہا ہے کہ لفظوں کی غلطی عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کیا ہماری یہ جنگ کوئی ذاتی یا خاندانی جنگ ہے؟ یا پرانے قبیلوں اور بادشاہوں کی عداوت ہے؟ کیا سمجھا تم نے؟ یہ تو طبقے طبقے کی لڑائی ہے۔ وہ جو روٹی آج ہمیں کھلا رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ سرمایہ دار طبقے نے تو اس سے زیادہ ظلم ڈھائے ہیں۔ پہلے یہی طبقہ تھا جو لڑائی کے بھی اصول اور ضابطے کی پابندی کا دعویٰ کیا کرتا تھا اور اب جیسے جیسے اس کا زوال قریب آتا جاتا ہے وہ خود اپنے دعوؤں پر پانی

پھیر رہا ہے۔ اس نے ضابطے، اخلاق اور معیار کا لبادہ بھی اتار پھینکا ہے۔ وہ گری سے گری حرکت کے لئے آمادہ ہے۔ یہ روٹیاں کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ اس کی ذلیل حرکتوں کے سامنے۔ یہی طبقہ تو تھا جس نے جرمنی میں اپنے سیاسی حریفوں کو کھانے میں زہر ملا کر دیا۔ ملا بار میں اسی طبقے نے اپنے سیاسی حریفوں کے سر میں کیلیں ٹھونکیں۔ یہ اس کی تہذیبی پستی ہے۔ اور اس کی موت کی علامت ہے۔ کیا ہم اسی سطح پر اترنے کے لئے آمادہ ہیں؟ تو پھر ہم کیوں جنگ کر رہے ہیں؟" کھرڈیکر سانس لینے کے لئے رُکے۔

"ہم انسان اور انسانیت کے احترام کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ ہم ایک بلند تہذیب کے لئے صف آرا ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں اقتدار آئے گا تو ہم محنت کش طبقے کی اعلا تہذیب اور بلند اخلاق کا ثبوت پیش کریں گے اور دنیا کو دکھا دیں گے کہ ہمارا طبقہ اعلیٰ قدریں رکھتا ہے۔ بہتر تہذیب رکھتا ہے، اور جبر، ظلم، اور انتقام سے زندگی کو پاک کرنا جانتا ہے۔ ہمارا انقلاب کسی ایسی خانہ جنگی یا محض خون خرابے کا نام نہیں ہے جس میں ایک گروہ دوسرے گروہ سے انتقام لیتا پھرے۔ ہمارا انقلاب تو زندگی کے شاندار مستقبل کا نام ہے امن، سدھار، ترقی اور یک جہتی کا نام ہے جس میں انسان کو بہتر سے بہتر مادی اور اخلاقی حالات میسر ہوں گے۔"

کسی نے اِس بات کو رَد نہیں کیا۔

۲۳ جون ۱۹۴۹ء

غزل اور نظم

یہ ہماری کوڈ لینگ دتیج (اشارتی زبان) ہے
ہم نے اپنی ملاقات کی دو حسیناؤں کو یہ نام عطا کیئے ہیں۔ ایک کو غزل
دوسری کو نظم۔ اگلے وقتوں کے ایک بزرگ کہہ گئے ہیں کہ جب کام اس سے
آپڑے جس کا نام "ستمگر" پڑ گیا ہو تو ایسے موقعے پر خیریت اسی میں ہے کہ
"کوڈ لینگ وتیج" سے کام نکال لیا کرو مثلاً مشاہدہ حق کو بادہ و ساغر کہہ دیا
ناز و غمزہ کو دشنہ و خنجر۔

استعاروں کی اس زبان میں بڑا فائدہ رہتا ہے۔
جس کے سر پر استعارے کی ٹوپی ٹھیک بیٹھے اس پر بار نہیں گزرتی۔
جس کے ہاتھ سے یہ ٹوپی بٹھائی جائے اس کے سر پر مار نہیں پڑتی۔
یہ کوئی آج کی دریافت نہیں ہے۔
یہ دریافت ہے ان بزرگوں کی جنھوں نے غزل میں استعاروں سے کام لیا اور
اگر وہ استعارے سے یا کوڈ لینگ دتیج سے کام نہ لیتے تو بات بات پر
خنجر چل جاتے۔

جس حسینہ کا نام ہم لوگوں نے غزل رکھا ہے

اس کی بھی کیا بات ہے۔

بوٹا سا قد، نازک کامنی سا بدن۔ مخمل پر چلے تو تلوے پھلتے ہیں۔ پھولوں میں لپٹے تو مہک ہو کر بس جاتی ہے۔ کلائی پکڑ لو تو گرم ہاتھوں کی حرارت سے عرق عرق ہو جائے۔ آہوے وحشی کی سی نظریں ابھی یہاں اور ابھی وہاں۔ اس کی رفتار دیکھ کر "موج مے" لرزتی ہے اور گفتار سنو تو معلوم ہو کہ پی کر بہک جانے میں کیا مزا ہے۔ ایک بات میں پیغمبرانہ واقعیت ہے تو دوسری بات میں معصومانہ جھوٹ ہوائی دیدے سے انتشار ٹپکتا ہے اور چہرے بشرے سے بلا کا بناؤ سنگار۔ اگر وہ بگڑ جائے تو لاکھوں بناؤ۔ اور رنگ اُڑے تو اور نکھار۔

لطیف پھولوں کے ایسے گلُ دستے کو، جی چاہتا ہے گلُ دان میں سجا لو اور فرصت کے لمحوں میں بیٹھے تکا کرو۔

غزل ویسے تو کم سن نہیں ہے (کیوں کہ میں نے اُس کے ماتھے پر زمانے کے نرم و گرم کی اُبھاری ہوئی شکنیں بھی دیکھی ہیں) لیکن بڑے چاؤ سے پلی ہے۔ چونچلوں میں رہی ہے اور غرورِ حسن نے اسے کم سنوں سے زیادہ نازک بنا رکھا ہے۔

میں نے اس سے اس کا سن و سال نہیں پوچھا۔

کہتے ہیں لڑکیوں سے ان کی عمر پوچھنا بدتمیزی ہے اور بارگاہِ حسن

میں مجھ سے بدتمیزی نہیں ہوتی۔

نظم تو بالکل پڑوسی ہی ہے۔
پڑوسی سے میرا مطلب ہے پڑوس کی بیٹی (اور جو ایک کی بیٹی ہے،
وہ دوسرے کی محبوبہ ہوگی)
اس کے جمال میں وہ بات،
کہ بس " رہزنِ تمکین و ہوش "
بھرے بھرے گال۔ گداز بدن۔ کشیدہ قامت۔ انداز میں متانت
بھی اور رکھ رکھاؤ بھی اس کے جمال میں جلال کی پرچھائیں بھی ہے
رفتار و گفتار میں ٹھہراؤ بھی ہے، سنجیدگی بھی اور پھر ان سب کے
ساتھ رعنائی بھی۔ لباس میں توازن۔ اداؤں میں ترتیب اور سلیقہ
وہ غزل کا سا الھڑ پن نہیں۔ نزاکت کم ہے، تحمل زیادہ۔ اس کے
سراپا میں مجھے تاج محل کم نظر آتا ہے۔ فتح پور سیکری زیادہ۔
زیب النسا کم ہے اور جھانسی کی رانی زیادہ۔ اس کے قدموں پر
چاندنی بھی بہار دیتی ہے اور چلچلاتی دھوپ بھی۔
رنگ اس کا، جیسے میدہ اور شہاب۔
جبھی تو کچھ لوگ اسے اینگلو انڈین کہتے ہیں۔
ایسی کھلتی ہوئی رنگت ہمارے ہاں خال خال ہوتی ہے۔

اکثر نہیں ہوتی۔

ہو نہ ہو، مس نظم ہیں یور یشین ہی۔

ان سے اظہارِ عشق کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس کے لئے پہلے سُلجھی ہوئی عبارت سوچ لوں۔ کیوں کہ یوریشین نسل کی لڑکیاں، سُنا ہے کہ شوق کی رمزیّت سے بہت بدکتی ہیں اور افلاطونی اندازِ عشق کے جھمیلے میں پڑنے سے گھراتی ہیں۔

دو چار ملاقاتوں میں کھل جائیں پہلے۔

پھر میں کہہ دوں گا کہ جانِ عزیز!

ہمارے عشق میں کچھ قومی تہذیب کا رنگ بھی ہے۔

یہ تھوڑی سی افلاطونیت تو تمھیں سہارنی پڑے گی۔

۹ راگست ۱۹۵۱ء

عشق و ممنوٗ

غزالی کے ہجر نے پہلے دن تو بڑی ویسی حالت کر دی تھی۔ صبح ہوتے آنکھ لگی۔ دن چڑھے تک سویا۔ سو کر اٹھا تو طبیعت ذرا فارغ تھی۔ دل نے ٹوکا کہ "بس جناب سُبک دوش ہو گئے آپ؟ ارے دو چار دن تو اس کا ماتم کیجیے۔"

میں نے کہا "کیا بکتے ہو؟" ماتم اور کیسے کیا جاتا ہے؟ سڑکوں پر خاک اُڑاؤں؟ گریبان چاک کر ڈالوں؟ کیا کروں آخر؟

پھر کئی دن گزر گئے تو میں نے سوچا۔ اچھی بات ہے چاہت کی کچھ نہ کچھ لاج ضرور رکھیں گے۔ زرا گھر مل جائے۔ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا ہو جائے تو پھر ایسی کوئی چیز لکھوں گا جس میں میرے دل کی دُکھن اور اس کی تمنا کی تازگی، دونوں محفوظ ہو جائیں۔

کسی کا تصوّر ہو یا ماتم دونوں کے لئے ضروری ہے کہ پہلے فرصت ہو۔ پھر پیٹ کے جہنّم کو ایندھن ملتا رہے اور کہیں سر چھپانے کے قابل ٹھکانا بھی حاصل ہو۔

خدا کو لوگ لامکانی کہتے ہیں لیکن اس کے تصوّر اور قوم کے ماتم کے لئے بھی ایک گھر بنا رکھتے ہیں کہ اس کے بغیر کچھ بات بنتی نہیں۔

میں نے دیکھا کہ یاد یار ایک مصرع طرح لے کر آئی اور کسی شعر کہلوا کر لے گئی۔ جی چاہا کہ پہلی فرصت ملے تو ایک نظم کہیں۔ پھر خیال آیا کہ نظم اپنا میدان نہیں ہے، نثر میں دل کا بخار نکالا جائے کچھ۔ چند روز کے اندر اندر نثر کے کسی عنوان سوجھے اور دل بے قابو ہو گیا۔ مجھ پر اس مصرع کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں آگے درد تھا۔"

خیالات کی کئی پگ ڈنڈیاں درد کی ہرٹیں کے ساتھ اُبھرنے لگیں۔

میں نے سوچا۔ بس دو دن اور ضبط کر و۔ چاروں طرف کوششیں کر رہا ہوں کہیں نہ کہیں گھر ملنے ہی والا ہے۔ اور گھر ملا نہیں کہ فوراً ایک سوئی کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا اور قلم کاغذ لے کر ان پگڈنڈیوں کے نشان نقش کرلوں گا۔

دو دن گزرے۔ چار دن گزرے، ہفتے گزرے، مہینے گزر گئے اور گھر ملنے کی کوئی سبیل نہ ہوئی۔ صبح و شام زلفوں جیسی خانہ بدوشی میں کٹتے چلے گئے۔ اور پرانے مسائل نئے مسائل کی اوٹ میں کھوتے چلے گئے۔

ایک دن میں یوں ہی خسرو باغ میں عاشقی کے پرانے تکیے پر بیٹھا تھا بے خبر۔ کہ سامنے والے درخت پر گھنی اکاش بیل کے نیچے کچھ دھندلے سے نقوش نظر آئے۔ میں اٹھا اور بے توجہی سے یوں ہی بیل کی شاخیں ہٹا کر دیکھنے لگا۔ فیض کی نظم کے چند مصرعے کھدے ہوئے تھے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اگرچہ اب تحریر کو پہچاننے کے بعد لکھنے والی کا نام پڑھنے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی لیکن میں نے یہ نام ایک بار سے زیادہ ہجے کر کے پڑھا۔ سنبھال سنبھال کر پڑھا۔ لذت لے کر پڑھا۔ اور جلدی سے گھنی اکاش بیل کی ٹہنیوں کو ہاتھ سے

چھوڑ دیا۔ بیل پھر پھیل گئی۔ اور اس نے درخت کے نقوش کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ درخت کی قوتِ نمو انھیں پہلے ہی بہت کچھ بھر چکی تھی۔

مجھے غالب کے اس مصرع میں کچھ غلطی محسوس ہوئی۔

"زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟"

اور میں نے غالب سے کہا: جی ہاں بندہ پرور، یوں بھی ہوتا ہے۔ زخم بھر جاتے ہیں اور ناخن نہیں بڑھتے

دسمبر سنہ ء

علم اور شعر

کل میں نے سردار جعفری سے ایک نظم سُنی۔

اب تک ایشیا کی سربلندی پر جتنی نظمیں اردو میں میری نظر سے گزری ہیں یہ اُن سب میں بہتر نظم ہے۔

جعفری کے کلام میں روز بروز گیرائی اور گہرائی آتی جا رہی ہے۔

مجھے خیال آیا کہ جعفری وہ آدمی ہیں جن کی شاعری مجھے دس برس پہلے معمولی درجے کی چیز معلوم ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے خاص ہم عصروں اور ہم عمروں میں سب سے کمزور شاعر ہیں اس خیال میں ۱۹۴۸ء سے برابر تبدیلی ہوتی گئی ممکن ہے اس میں خود میرے مذاق کی تبدیلی کو بھی دخل ہے۔ آدمی کے متعلق رائیں

بھی بدلتی رہتی ہیں اور خود آدمی بھی بدلتا رہتا ہے۔ رائے دینے والا بھی اور جس پر رائے دی جائے وہ بھی۔

جعفری اس گروپ کے ایک فرد ہیں جسے سنہ ۳۰ء اور سنہ ۴۲ء کے درمیان علی گڑھ کی ہنگامہ پرور سرزمین نے جنم دیا اور پالا۔ مجاز، جذبی، جاں نثار اختر بھی اسی دور کے شاعر ہیں اور بعد میں اختر الایمان بھی۔

جس زمانے میں یہ لوگ آنکھیں اور لب کھول رہے تھے اس زمانے میں جذبی کی شاعرانہ صلاحیت پختہ تر ہو چکی تھی۔ مجاز اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مقبول اور خوش گو شاعر نظر آنے لگے تھے۔ جوش کی ہمہ وقت قربت نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ مجاز ہی آگے چل کر جوش کی گدی سنبھالیں گے۔ ان دونوں کے بعد جاں نثار تھے۔ جعفری کا نمبر سب کے بعد آتا تھا۔ ان میں فکر کا عنصر تو تھا لیکن ڈھکا چھپا، مگر شعری نغمگی بس یوں ہی تھی برائے نام۔ نشاطِ روح کے لئے اکثر نغمۂ عشرت کی ضرورت ہے تو کبھی کبھی صدائے درد کی بھی۔ پہلی لذت مجاز کے ہاں چھائی ہوئی تھی اور دوسری جذبی کے یہاں۔ جاں نثار بین بین تھے اور جعفری صرف سوچے ہوئے چند اچھے مصرعے کہنے کے قصور وار۔

مجاز کو تو شراب پی گئی اور وہ خواب گاہوں میں تھک تھکا کر سو گئے[1]۔ جذبی

۱؎ جب یہ سطریں چھپنے جا رہی ہیں تو وہ رانچی میں دماغی بیماریوں کے شفاخانے میں پڑے ہوئے ہیں

غریب اپنی شکست کی آواز اور بی اے کلاس کا لیکچر بن کر رہ گئے۔
جاں نثار کبھی جھٹکوں سے سلامت نکل آئے، مگر وہ تیز نہیں چل سکتے۔ اُن
کا دم پھول جاتا ہے۔ اور اختر الایمان

تاریکی میں ڈھونڈھتا ہوں راہیں
سُورج کو ترس گئیں نگاہیں

بہت ہوا تو ——— "لہو تڑپ کے مچلنے لگا شبستاں میں"۔
صرف جعفری رہ گئے جنھوں نے اپنی نامقبولیت کے راز کو سمجھا۔ جی لگا کر،
سسٹم بنا کر مطالعہ بھی کیا۔ ریاضت کی، لکھا بھی اور خود کو پھیلایا بھی۔
۱۹۴۰ء کے اِرد گِرد پنجاب سے نئے شاعروں کا ایک لشکر اُٹھا۔ پنجاب کے ہر کام میں ہمہمہ
شور، طنطنہ اور آوازہ بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعری کی بساط پر بھی انھوں نے
آتے ہی نقارے بجا دیئے۔ ن م۔ راشد، میرا جی، فیض، یوسف ظفر، قیوم نظر
شریف کنجاہی، قتیل شفائی، عدم، احمد ندیم، بیقت، مخمور، ساحر اور کئی۔
ان میں تاثیر اور احمد ندیم کسی قدر پرانے تھے اور ساحر سب سے نئے۔ ابتدا میں
ہر ایک اپنے عہد کا مجدد معلوم ہوتا تھا لیکن آخر میں احمد ندیم اور فیض سب سے
آگے رہے۔ فیض نے تو صرف چند نظمیں اور غزلیں پیش کر کے اُردو شاعری کو بالکل
ایک نیا اور کامیاب تجربہ بخشا کیوں کہ فیض کے یہاں فکر کی گہرائی تھی، تاثر
کی شدت تھی اور انداز بالکل اچھوتا اور دل گیر تھا۔
دوڑنے والے فیض کے ساتھ بھی دوڑے۔ جعفری کے ساتھ بھی۔ لیکن یہ دونوں

شاعر اپنے ساتھ کے دوڑنے والوں میں سب سے تیز دوڑے۔ کیونکہ ان کے پاس فکر کی قوت زیادہ صالح تھی اور انھوں نے فکر کے لئے وسیع مطالعے اور علم کی پشت پناہی حاصل کی۔ اردو شاعری میں خاص طور سے ادھر یہ سمجھنے کا دستور سا پڑ گیا ہے کہ شاعر، اچھا شاعر، بلکہ بڑا شاعر بننے کے لئے صرف شاعرانہ صلاحیت کافی ہے۔ شاعرانہ صلاحیت سے مراد لی جاتی ہے نغمگی، موزونیت، الفاظ پر قدرت اور تراکیب کا ذخیرہ اور بس۔ ترقی پسند تحریک نے ان لوگوں کو اپنی صف میں بلا کر ایک بات اور جتائی کہ شاعری کے لئے شعور کی بھی ضرورت ہے۔ شعور تندرست، سیدھا صاف، بے عیب اور سماجی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے شاعرِ انقلاب سے لے کر کیفی اعظمی تک ہر ایک نے شاعری کی بنیادی قدریں عملی طور پر یہ رکھ لیں کہ اچھا اور بڑا شاعر بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی تحت الشعور سے خوش مذاق ہو، جوشیلا ہو، خوش بیان ہو اور شعوری طور پر سماج کی بہتری چاہتا ہو۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ جوش میں تو گھن گرج، مشقِ سخن اور زبان و بیان کی ایسی بے پناہ قدرت تھی کہ وہ انھی پروں سے اونچی پرواز کرتے رہے لیکن نئی امت میں جن کے پاس یہ بھی نہیں تھا وہ آس پاس کے اونچے کنگروں تک اڑے اور وہیں ٹھکانا بنا کر بیٹھ گئے۔ کیفی اعظمی کی مثال اس کا کھلا ثبوت ہے کہ شروع میں ان کے پاس شاعری کے بعض ضروری اجزا جعفری سے زیادہ تھے اور اگر وہ علم اور شعر کے گہرے تعلق کو سمجھتے تو آج انھی کا ستارہ اوج پر ہوتا۔ یہی حال اور بہت سے نوجوان شعرا کا ہوا ہے۔

جب ابنِ آدم بالکل بھولا تھا اور فطرت کے شعبدوں کا منھ حیرت سے تکا کرتا تھا جیسے

بچے چاند میں چرخہ کاتنے والی گڑیا کو دیکھتے ہیں) اس وقت شعر کو علم کی اتنی زیادہ ضرورت نہ رہی ہوگی جتنی موسیقی اور قوتِ بیان کی لیکن تہذیب اور انسانی علم کی ترقی کے ساتھ ہر دور میں یہ واقعہ ہے کہ علم اور شعر کا رشتہ گہرا ہوتا گیا ہے۔ جن زبانوں کے ادب تک میری پہنچ ہے جب میں ان کے بڑے بڑے شاعروں کو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہ جو اپنے ہم عصروں سے آگے نکل گئے اور آج تک زندہ ہیں۔ اپنے اپنے زمانوں کے رائج علوم پر اچھی طرح حاوی تھے اور عصری معلومات پر اتنی مہارت رکھتے تھے کہ ان کو سیڑھی بنا کر اوپر چڑھیں اور وہاں سے دور تک دیکھ سکیں۔ تہذیب نے جہاں جہاں اور جیسے جیسے یہ منزلیں طے کی ہیں علم اور شعر کا یہ باطنی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا ہے۔

امرالقیس کے قصیدے کو یمن اور ملا بار یا شام و مصر کے تجارتی اور علمی رشتے جاننے کی اتنی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف دارالجلجل کا ذکر مزے لے کر بیان کرنا کافی تھا۔ مگر خیام کی شاعری کو جس چیز نے زندہ شاداب اور پائندہ کیا وہ فٹز جیرالڈ کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ خیام کی وہ فلسفہ دانی ہے جس نے اپنے ہم عصروں سے حجتہ الحق کا خطاب پایا۔ خیام کے زمانے میں یونان اور ہندستان اور مصر، علم و تہذیب کے گہوارے تھے، اور یہاں فلکیات، نجوم، فلسفہ، ریاضی، فقہ، منطق وغیرہ کا زور تھا۔ اپنے ہم عصروں میں خیام ایک ایسا شاعر تھا جس نے ان تمام علوم پر بے مثل مہارت حاصل کی اور اس کے بعد شعر کہے۔ چنانچہ اس کے کلام میں وہ بلند نظری اور بار یک بینی پیدا ہو گئی جس نے اٹھارویں [18]، انیسویں [19] صدی

کے تہذیب یافتہ یورپ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

بڑی حد تک یہی رہا ہے علامہ اقبال تک ہر ایک بڑے شاعر کی عظمت اور اس کی پائندگی کا

شعور کی گہرائی، گیرائی، بیان کی تازگی اور ندرت اور موضوع کی صحت مندی اور شادابی کے لیے صرف ترقی پسند نظریے پر ایمان لے آنا اور آنکھیں بند کیے اس کی ڈگر پر چل کر شعر موزوں کر لینا کافی نہیں ہے! اس کے لئے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ گہری نظر کی، جد و جہد کی۔ سماج کے ایک ایک جوڑ بند کو تہ تک سمجھنے کی اور اپنے زمانے کے رائج علوم کو ہضم کر لینے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے علم اور شاعری سے کسب نور کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ پہلے یہ سب ہو اور پھر جذبے کی شدت ہو اور اسی کے ساتھ زبان و بیان پر خوب قابو ہو اور پھر موسیقی اور نغمگی کا رچا ہوا مذاق ہو۔ تب کہیں آدمی شاعر ہوتا ہے شاعر سے اچھا شاعر ہوتا ہے۔ اچھے شاعر سے بڑے شاعر کی منزل کی طرف کوچ کرتا ہے۔ سردار جعفری نے کل جو نظم سنائی اُس سے مجھے خیال گزرا کہ آخر الذکر اوصاف حالانکہ ان کے ہاں ابھی منجھے نہیں ہیں لیکن وہ اچھے شاعر اور بڑے شاعر کے ڈانڈوں پر کھڑے ہیں۔ عجب نہیں جو وہ چھلانگ لگا جائیں۔ بشرطے کہ وہ اپنی پبلسٹی کے فریب میں اسیر نہ ہوئے۔

۳ر فروری ۱۹۵۱ء

قیصر محمود ایم اے نے رائٹرس اکاڈمی کیلئے یونائیٹڈ فائن آرٹ پریس میں چھپوایا